نبیوں کا پاکیزہ بچپن

اور

جوانی

از
مولانا اخلاق حسین قاسمی

بہ اہتمام انور دہلوی مہتمم مکتبہ دینیات
محبوب المطابع جامع مسجد دہلی
میں طبع ہوئی۔

پہلا ایڈیشن ایک ہزار
قیمت ایک روپیہ

نومبر سنہ ۱۹۶۰ء

نبیوں کا پاکیزہ بچپن

اور

جوانی

مطالعہ سے پہلے

آج کی دنیا میں نبوت اور رسالت کے بارے میں دو قسم کی گمراہیاں پھیلی ہوئی ہیں۔

ایک تو وہ طبقہ ہے جو نبوت کی حقیقت سے بے خبر ہونے کے سبب ہر مصلح قوم اور ریفارمر کو پیغمبر کہنے لگتا ہے۔

دوسرا وہ طبقہ ہے جو پیغمبرانہ کمالات کے حقیقی سرچشمے سے ناواقف ہونے کی بنا پر نبی اور رسول کو الوہیت میں شریک، خدا کا بیٹا اور ایشور کا اوتار سمجھنے لگتا ہے۔

نبوت کے متعلق یہ وہ افراط وتفریط ہے جس میں "امت وسط" یعنی مسلمانوں کے علاوہ تمام قومیں مبتلا ہیں۔

پیش نظر کتابچہ میں دونوں قسم کی گمراہیوں کا پردہ چاک کر کے نبوت کی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔

اخلاق حسین قاسمی

خلاصہ!

اوپر جو واقعات نقل کئے ان کا مقصد یہ ہے کہ قارئین رسالت اور نبوت کی اصلیت کو سمجھ لیں۔

نبوت کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے ایک رسول کس طرح ذہنی بلندی اور کیرکٹر کی پاکیزگی کا نمونہ دنیا کو دکھاتا ہے اس کا اندازہ لگانے میں قارئین کو اب دشواری پیش نہیں آسکتی۔

نبوت کے بعد ایک رسول جن ممتاز ذہنی، فکری، علمی اور عملی قوتوں سے آراستہ ہوتا ہے اس کے بیان کے لئے ایک بسوط کتاب درکار ہے۔

البتہ ذیل میں رسولان پاک علیہم السلام کی ایک خاص قوت کی وضاحت کی جاتی ہے جو اصل میں نبوت کا حقیقی جوہر ہے اور جسے دنیا کی قوموں نے نظرانداز کر کے بہت بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔

میرا اشارہ اس طرف ہے کہ اسلام سے قبل دنیا کی قوموں نے نبوت کے کمالات کو دیکھ کر ان کے بارے میں ایک غلط خیال قائم کر لیا۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ آپ نے پیغمبرانہ

اعجاز کے ذریعہ خدا کی دی ہوئی طاقت سے مُردوں کو زندہ فرمایا، مٹی کے پرندے بنا کر ان پر پھونک ماری اور وہ زندہ ہو کر اڑنے لگے۔

ان کمالات کو نصاریٰ نے دیکھا اور انہیں خدا کی الوہیت میں شریک کر لیا۔ ایک رسول کو خدا کا بیٹا کہنے لگے اور ان میں خدا کی قوتیں تسلیم کی جانے لگیں۔

حضرت عزیر علیہ السلام یہودیت کو نشاۃ ثانیہ دینے والے مسلمان ہیں خدا تعالےٰ نے ان میں علم و حافظہ کی بے پناہ قوتیں رکھی تھیں۔ انہوں نے مٹی ہوئی توراۃ کو محض اپنی یاد سے دوبارہ لکھوایا اور صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قوم کو آزادی دلوائی۔

یہودیوں کے ایک طبقہ نے اللہ کے اس مقدس رسول کو خدا کا بیٹا کہدیا۔

فرشتوں کے ساتھ بھی یہی مذاق ہوا مکہ کے مشرکین فرشتوں کی غیر معمولی قوتوں کے واقعات سنکر انہیں خدا کی بیٹیاں کہنے لگے۔

اسی طرح ہندوستان میں کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے توہم پرستوں نے خدا کا اوتار نہ کہا اور ان کی پوجا شروع نہ کی۔

حاصل یہ کہ آج دنیا کی قوموں میں نبوت کا کوئی تصور نہیں ہے کہیں خدا کا بیٹا ہے کہیں اوتار ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ لوگوں نے رسولوں کے کمالات کے حقیقی سرچشمہ کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔

وہ حقیقی سرچشمہ کمالات کیا ہے ؟۔

وہ انبیاء علیہم السلام کی "مکمل بندگی" ہے، شان عبدیت ہے۔

اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

انبیاء علیہم السلام کا حقیقی کمال

جائے کہ شیر مرداں در معرضِ عتاب اند
روباہ سیر تاں را آں جا چہ تاب باشد

انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات کو قرآنِ حکیم جس خوبی سے بیان کرتا ہے وہ خدا کے اس مقدس کلام ہی کا حق ہے۔

یہ خدا تعالیٰ کا مقدس کلام، وہ خدا کے مقبول بندے! اس سے زیادہ نہ انہیں کوئی سمجھ سکتا ہے اور نہ سمجھنے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ دنیا نے جب کبھی خدا کے کلام سے ہٹ کر اپنے ان ہادیوں اور پیشواؤں کو سمجھنے کی کوشش کی تو وہ جذباتِ عقیدت کی رو میں بہہ گئے۔ فکرِ صحیح سے بھی محروم ہوئے اور عمل و اخلاق کی بہترین زندگی بھی انہیں میسر نہ ہو سکی۔

مندرجہ ذیل سطروں میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی سیرت کا ایک خاص پہلو پیش کیا گیا ہے۔ وہ پہلو جسے قرآن حکیم نے خاص طور پر جگہ جگہ نمایاں

کیا ہے اور اس سے نوع انسانی کو ہدایت کا ایک گراں قدر سبق دیا ہے۔

وہ پہلو ہے ـــــ عبدیت اور بندگی، عجز و نیاز۔ انبیاء علیہم السلام ہر آن اور ہر لمحہ اپنے مالک حقیقی کی طاقت پر نظر رکھتے ہیں، اسی کی طاقت کو اصل طاقت سمجھتے ہیں، اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ پیغمبران علیہم السلام کے پاس کسی قسم کی طاقت نہیں ہوتی، نہیں ہوتی ہے۔ ان کے پاس خدائی طاقت کے غیر فانی خزانے ہوتے ہیں۔ ایسے خزانے نہیں جن کا خود پیغمبر کو علم نہ ہوتا ہو، بلکہ ایسے خزانے جن کا یقین و مشاہدہ پیغمبر کو بھی ہوتا ہے اور ان لوگوں کو بھی جو پیغمبر کو ایمان و بصیرت کی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں۔

طاقت کی تفسیر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو یقین کامل ہوتا ہے کہ وہ خدا کی بارگاہ میں مقبول و منصور ہیں، اس لئے کائنات کی ساری قوتوں کا ان کے اشارے پر حرکت میں آنا یقینی ہے۔ خدا کے وعدوں میں انہیں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہوتا۔ انہیں اپنے ہادی اور مہدی ہونے کا بھی یقین ہوتا ہے اور ہر قسم کی کمزوریوں سے محفوظ اور معصوم ہونے کا بھی ـــــ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ اپنے آپ کو ایک عاجز بندے کی طرح پیش کرتے ہیں۔ ان میں ایک بے مقدور بندے کی طرح بے قراری اور بے چینی ہوتی ہے، ان کا دست سوال ہر وقت خدا کے آگے پھیلا رہتا ہے، کسی لمحہ بھی انہیں مطمئن نہیں دیکھا جاتا۔

وجہ اس کی ظاہر ہے ـــــ وہ خدا تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا قوی تصور رکھتے ہیں، خدا کی بے پناہ قوت و اقتدار ہر آن ان کے مشاہدہ میں رہتا ہے، کوئی دوسرا نہ اتنا ادراک رکھتا ہے نہ علم۔

اس حقیقت کی چند مثالیں قرآن حکیم سے پیش کی جاتی ہیں۔

پہلی مثال

حضرت شعیب علیہ السلام نے جب مدین والوں کو حق کی دعوت دی تو مدین کے بڑے آدمیوں نے حضرت شعیب (علیہ السلام) کو دھمکی دی اور کہا:

"ہم تجھے اور تیرے ساتھیوں کو بستی سے باہر کر دیں گے یا یہ ہو کہ تم اپنے آبائی دین میں واپس لوٹ آؤ۔"

ملک بدر کرنے یا کفر اختیار کرنے کی دھمکی سنکر حضرت شعیبؑ نے فرمایا:

"اگر ہم تمہاری دھمکی میں آ کر دین حق چھوڑ دیں اور پھر کفر اختیار کر لیں تو اس صورت میں ہم خدا تعالیٰ پر جھوٹ کا بہتان باندھنے والے قرار پائیں گے۔"

وما یکون لنا ان نعود فیھا الا ان یشاء اللہ ربنا۔ (سورۃ اعراف) "اور ہمارا کام نہیں کہ پھر آ دیں اس میں مگر کبھی اللہ چاہے رب ہمارا۔"

یعنی ہمارے لئے نہ یہ بات ممکن ہے اور نہ ہمیں یہ بات لائق ہے کہ ہم ہدایت پر آنے کے بعد پھر گمراہی میں مبتلا ہو جائیں، البتہ اگر خدا تعالیٰ ہی کی مشیت یہ ہو تو اور بات ہے۔

ایک پیغمبر کے لئے ناممکن ہے کہ وہ کفر اختیار کرے۔ جب منصب نبوت پر فائز ہونے سے پہلے ایک نبی کفر و شرک سے پاک رہتا ہے تو پھر رسول ہو جانے کے بعد وہ کیسے اس تاریکی کی طرف لوٹ سکتا ہے۔

نبی کو خود بھی اپنے اس مقام عصمت کا یقین ہوتا ہے اس کے دل میں اس بات کا خطرہ بھی نہیں گذرتا کہ میں معصیت میں بتلا ہو سکتا ہوں۔ پھر حضرت شعیبؑ نے ___ ان یشاء اللّٰہ ___ یعنی اگر اللہ چاہے، کیوں کہا۔ یہ جملہ عموماً ان ہی موقعوں پر بولا جاتا ہے جہاں دوسرے پہلو کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔

پس اس جملہ کے استعمال کی یہی توجیہہ ہو سکتی ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے دل میں خدا کی عظمت و بے نیازی اور اس کے مقابلہ میں اپنی عبدیت و نیازمندی کا زبردست احساس موجود تھا۔ ایسا احساس جس کی مثال انبیاء کے سوا دوسری جگہ ملنی مشکل ہے۔ اس جملہ سے حضرت شعیبؑ کا مطلب یہ تھا کہ میں پیغمبر ہوں میرے لئے ممکن نہیں کہ میں کفر اختیار کروں۔ لیکن اتنا بڑا دعویٰ میں اپنی طاقت کے بل بوتے پر نہیں خدائے تعالےٰ کے بھروسہ پر کر رہا ہوں اور ایک نبی کی نظر ہمیشہ خدا ہی کی ذات پر ہوتی بھی ہے۔

دوسری مثال

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کے بعد دعاء فرمائی:

رب اجعل ھذا البلد اٰمنا واجنبنی وبنی ان نعبد الاصنام۔	"اے رب کر اس شہر کو امن کیا اور بچا مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے کہ ہم پوجیں مورتیاں۔"

ابراہیم علیہ السلام توحید کے داعی اعظم تھے، انبیاء علیہم السلام میں یہ اسی خطاب سے پکارے جاتے ہیں۔ توحید کا داعی یہ دعا کر رہا ہے کہ مجھے بت پرستی

سے بچا۔ کیا ابھی تک ابراہیمؑ بت پرستی سے بچے نہیں تھے اور کیا زندگی کے کسی دور میں بھی ان سے بت پرستی کا ارتکاب ہوا تھا؟ ــــ نہیں ــــ قطعاً نہیں ہوا۔ پھر یہ دعا کیسی۔؟

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی اشکال سے بچنے کے لئے ترجمہ میں یہ رعایت رکھی ہے، فرماتے ہیں ــــ "دور دار مرا"ــــ یعنی دور رکھیو مجھے۔ جس طرح بچانا تیرا ہی کام ہے اسی طرح اس پر قائم رکھنا بھی تیری ہی عنایت پر موقوف ہے۔

اصل میں تو حضرت ابراہیمؑ کو دعا کرنی تھی اپنی اولاد کے لئے۔ لیکن اگر صرف اولاد کے لئے دعا کرتے تو اس سے کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ کیا حضرت ابراہیمؑ خود اپنی طرف سے مطمئن ہیں، خود بے نیاز ہیں؟ جو اس موقعہ پر اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں فرماتے۔

یہ صحیح ہے کہ ایک نبی کو کفر و معصیت کے ہر خطرہ سے مطمئن ہونا چاہئے اور در حقیقت وہ ہوتا بھی ہے لیکن وہ اطمینان اسی درجہ میں ہوتا ہے کہ نبی کی عبدیت و نیاز مندی اور توجہ الی اللہ میں فرق نہیں پڑتا اور یہی ان کی شان کا کمال ہوتا ہے کہ باوجود پورے اطمینان کے ہر وقت خدا پر نظر رکھتے ہیں، اس لئے استقامت کے ملتجی رہتے ہیں اور اپنے اس طرز عمل سے دنیا کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نبی معصوم ہوتا ہے، ضرور ہوتا ہے۔ لیکن نبی کی صفت عصمت بھی خدا تعالیٰ ہی حفاظت و صیانت سے قائم رہتی ہے۔ پس ان کے ماننے والوں کو بھی یہی چاہئے کہ خدا تعالےٰ کی

عظمت ہی کو اصل عظمت سمجھیں۔ انبیاء علیہم السلام کے کمالات پر شیدا ہو کر کمالات کے حقیقی سرچشمہ (ذاتِ حق) سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہ ہوں۔ اسی طریقہ کار سے ایمان کی حفاظت ہو سکتی ہے، ورنہ افراط و تفریط میں مبتلا ہو کر تباہ ہونے کا اندیشہ ہے۔

تیسری مثال

حضرت یوسف علیہ السلام زندگی کے آخری دور میں دعا فرماتے ہیں:

رب قد اتیتنی من الملک وعلمتنی من تاویل الاحادیث فاطر السموات والارض انت ولی فی الدنیا والآخرۃ توفنی مسلماً والحقنی بالصلحین (سورہ یوسف)	"اے رب تو نے دی مجھ کو کچھ سلطنت اور سکھایا مجھ کو کچھ پھیر باتوں کا اے پیدا کرنے والے آسمان و زمین کے تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں اور آخرت میں، موت دے مجھ کو اسلام پر اور ملا مجھ کو نیک بختوں میں۔"

یوسف علیہ السلام کو جس ذات نے ظاہری شان و شوکت (ملک) اور باطنی دولت (تاویل احادیث) سے بھرپور نوازا، کیا وہ اسلام پر ان کا انجام بخیر نہ کرتا اور کیا انہیں آخرت کی زندگی میں نیک بندوں میں شامل نہ فرماتا۔ اگر نبی کو بھی اپنے انجام کی بہتری کا یقین نہیں ہو سکتا تو پھر کیسے ہو سکتا ہے؟۔

یقیناً غلامی سے شہنشاہی کے مقام پر پہنچانے والے خدا کی طرف سے حضرت یوسف ؑ کو اطمینان تھا کہ وہ انجام بھی اتنا ہی شاندار کرے گا جتنا

شاندار اس نے آغاز یعنی دنیا کی زندگی کو بتایا ہے لیکن اس اطمینان ویقین کے باوجود بندگی و نیاز، افتقار و احتیاج کا یہ اعلان و اظہار اس لئے تھا کہ یہ اپنی جگہ ایک مستقل کمال ہے اور مستقل شان ہے جو ایک مقبول بندے کے مراتب کو بلندی سے انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے۔

نیز اس میں امت کے لئے یہ سبق ہے کہ جب ہم رسولان مقدس ہر آن اور ہر لمحہ بندگی اور عجز و نیاز ہی میں اپنا کمال سمجھتے ہیں تو تم بھی ہمیں حد بندگی سے آگے نہ بڑھانا اور ہم سے وہ معاملہ نہ کرنا جو خدائے قادر و قدیر سے کرنا چاہئیے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا ایک اور مقام بھی ملاحظہ فرمائیے:

شاہِ مصر کے سامنے جب مصر کی عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی پر شہادت دی اور اپنے قصور کا اعتراف کیا تو اس پر حضرت یوسف نے فرمایا:

"میں نے یہ تحقیق و تفتیش صرف اس لئے کرائی کہ میرے محسن عزیزِ مصر کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کی امانت میں خیانت نہیں کی۔"

حضرت یوسف ؑ نے اپنی براءت پر زور دیا، بغیر تحقیق کے جیل خانے سے باہر آنے سے انکار کر دیا۔ یقیناً ایک پیغمبر کو اپنی عصمت کا اسی طرح اعلان کرنا چاہئے تھا۔ حضرت یوسف نے اسی لئے ایسا کیا مگر ساتھ ہی یہ جو فرمایا:

وما ابرئ نفسی ان النفس لا	اور میں پاک نہیں کہتا اپنے جی کو جی تو
مارۃ بالسوء الا مارحم ربی	سکھاتا ہے برائی مگر جو رحم کیا میرے

ان ربی غفور رحیم۔ رب نے، بے شک میرا رب بخشنے والا
(یوسف) مہربان ہے۔

اس کی کیا وجہ ہے؟۔ اگر ایک رسول پاکیزہ نفس اور پاک دامن نہیں ہوتا تو کون ہوتا ہے؟۔

جواب یہ ہے کہ منصب نبوت کا تقاضا تھا کہ حضرت یوسفؑ اپنی برارت کا کھلے بندوں اعلان کراتے۔ چنانچہ جب اعلان کرایا تو صفت عبدیت اور شانِ بندگی جوش میں آگئی، خیال آیا کہ سننے والے یہ نہ سمجھیں کہ یوسف کو اپنی پاکدامنی پر ناز ہے، یوسف ازراہ.. شیخی معاملہ کی تحقیق کرا کر اپنی ثقاہت کا اعلان کرنا چاہتے ہیں، یوسف کو اپنی ذات اور اپنے کیرکٹر پر بڑا بھروسہ ہے۔

اس خیال کے آتے ہی فرمایا:

"میں نہیں کہتا کہ میرا نفس پاک ہے۔ پاک وہی ہے جسے خدا پاک رکھے خدا تعالیٰ کی رحمت خصوصی ہی ہے جو رسولوں کی عصمت و حفاظت کی کفیل بنتی ہے یوسفؑ کو اصل بھروسہ اسی پر ہے، اگر منصب نبوت کا تقاضا نہ ہوتا تو شاید میں اس پر اصرار ہی نہ کرتا، کرم ہے اس غفور رحیم کا کہ اس نے اس ابتلا میں یوسفؑ کو ثابت قدم رکھا اور آج حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے ان الفاظ پر بھی غور کیجئے:

الذی خلقنی فھو یھدین جس نے مجھے بنایا سو وہی مجھ کو کھلاتا
والذی ھو یطعمنی ویسقین ہے اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوں
واذا مرضت فھو یشفین، تو وہی شفا دیتا ہے اور وہ جو مجھ کو

والذی یمیتنی ثم یحیین   مارے گا پھر جلائے گا اور وہ جو مجھ کو
والذی اطمع ان یغفرلی   توقع ہے کہ بخشے میری تقصیر انصاف
خطیئتی یوم الدین۔ (شعرا)   کے دن"۔

ایک پیغمبر اور قیامت کے دن مغفرت کی توقع کا اظہار۔ جس کے دم سے لاکھوں کی مغفرت ہو، ہزاروں ہدایت پاکر بخشش کے مستحق بنیں وہ خود اپنی مغفرت کے لئے ان الفاظ میں محتاجگی کا اظہار کرے۔ پھر دعا کے الفاظ میں ادب کی رعایت اس قدر کہ تمام الفاظ کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف اور بیماری کی نسبت اپنی طرف۔

مکمل مثال

نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تو ساری زندگی اور زندگی کی تمام ادائیں اسی صفت عبدیت وافتقار کا روشن مظہر ہیں۔ آپ کی سیرت پاک کے ہر گوشے میں شانِ عبدیت کی جھلک موجود ہے۔ یہاں تک کہ آپ کے اسی کمال نے حضرت حق سے یہ اعلان کرا دیا کہ یوں تو بندے میرے کروڑوں ہیں مگر ان میں "بندہ" کا لقب پانے کا اگر کوئی مستحق ہے تو وہ ہمارے آخری نبی ہیں ـــــــ "محمداً عبدہٗ ورسولہٗ"۔

اس شانِ بندگی کا وجد آفریں منظر دیکھنا ہو تو بدر کے میدان میں پھونس کی بنی ہوئی اس جھونپڑی کی طرف دیکھو جس میں رحمت عالم اپنے کمزور مٹھی بھر غلاموں کے لئے دعا میں مصروف ہیں۔

خدا تعالیٰ نے وعدہ فرما رکھا ہے، ارشاد ہے:

انا لننصر رسلنا والذین امنوا فی الحیوۃ الدنیا۔ (القرآن الحکیم)

"بے شک ہم رسولوں کی، اور ایمان والوں کی مدد کریں گے اور دنیا کی زندگی میں"

خاص طور پر آج کے دن کے لئے بھی مدد اور فتح کی پیشین گوئی فرمادی گئی تھی:

وان کادوا لیستفزونک من الارض لیخرجوک منہا واذا لا یلبثون خلافک الا قلیلا۔ (بنی اسرائیل)

اور وہ تو چاہتے تھے کہ گھبرا دیں تجھ کو اس زمین سے تاکہ نکالدیں تجھ کو یہاں سے اور اس وقت نہ ٹھیریں گے وہ بھی تیرے پیچھے مگر تھوڑا۔

اس وعدۂ حق پر نبی کو یقین ہے، اپنے ساتھیوں کو اطمینان دلاتے ہوئے مدینہ سے باہر نکل کر ارشاد فرماتے ہیں:

سیروا علی برکۃ اللہ وابشروا فان اللہ قد وعدنی احدی الطائفتین واللہ لکانی الان انظر الی مصارع القوم۔ (ابن کثیر سورۂ انفال)

چلو خدا کی برکت ورحمت پر بھروسہ کرکے اور خوش خبری سنو کہ خدا تعالےٰ نے دو جماعتوں میں سے ایک جماعت پر فتحیاب کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور خدا کی قسم میں اس وقت دیکھ رہا ہوں کہ قریش کے لوگ کہاں کہاں پچھڑے پڑے ہیں۔

اس کے باوجود حالت کیا ہے؟ حضرت عمرؓ کا بیان سنئے یہ اس واقعہ

کے عینی شاہد ہیں۔

بدر میں میدان میں پہنچکر حضورؐ نے اپنے اصحاب پر نظر ڈالی وہ تین سو سے کچھ اوپر تھے، پھر مشرکین کے لشکر پر نظر ڈالی اور وہ ایک ہزار سے زیادہ تھے۔

تعداد کا یہ فرق دیکھ کر آپ اپنی جھونپڑی میں تشریف لے گئے اور قبلہ رخ ہو کر دعا فرمائی۔ اس وقت آپ کے جسم اقدس پر ایک چادر مبارک تھی اور تہبند زیب تن فرمائے ہوئے تھے۔ دعا فرمارہے تھے:

اللھم انجزلی ما وعدتنی — "خداوندا! مجھ سے جو وعدہ فرمایا ہے اسے پورا فرما۔"

کبھی سجدے میں گر کر فرماتے:

اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ من اھل الاسلام فلا تعبد فی الارض ابداً۔ — خداوندا! اگر تو نے اس قلیل لشکر اسلام کو ہلاک کر دیا تو روئے زمین پر کبھی تو پوجا نہیں جائے گا۔

حضورؐ یہ دعا فرماتے رہے اور آپ پر استغراق و محویت طاری رہی یہاں تک کہ آپ کے مبارک شانوں سے چادر مبارک کھسل گئی اور آپ اس عالم فانی سے بے خبر مشاہدہ جمال الٰہی میں ڈوبے ہوئے یہ التجا کرتے رہے۔

اتفاق کہئے یا الہام ربانی کا اشارہ کہ حضرت ابو بکرؓ جھونپڑی میں تشریف لے آئے۔ دیکھا کہ آقا پر عجیب کیفیت طاری ہے، برداشت نہ ہو سکا محبوب خدا اور اس قدر الحاح وزاری ---؟

حضرت ابوبکرؓ نے چادر اٹھائی اور اسے حضورؐ کے مبارک شانوں پر رکھ دیا۔ حضرت عمرؓ کے الفاظ ہی ملاحظہ فرمائیے

فاخذ رداءه فوداه ثم التزمه من ورائه ثم قال یا نبی الله کفاک مناشدتک ربک فانه سینجز لک ما وعدک۔	ابوبکرؓ نے چادر اٹھائی اور اسے کندھوں پر ڈال دیا پھر پیچھے سے حضور کے چمٹ گئے اور عرض کیا۔ حضور آپ نے اپنے رب سے کافی مناجات کر لی، بس خدا تعالےٰ ضرور اپنا وعدہ پورا فرمائے گا۔

ظاہر کی آنکھیں بند کر کے تصور کی آنکھیں کھول لیجئے، غلام آقا کے چمٹے ہوتے ہیں اور تسلی دیتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ بس کیجئے سرکار! بہت دعا فرمالی، خدا تعالیٰ ضرور اپنا وعدہ پورا فرمائے گا۔

جو کیفیت آقا پر طاری تھی وہی کیفیت یار غار صدیقؓ پر بھی طاری ہو گئی۔

حضورؐ کا اپنے مولیٰ کے سامنے یہ فرمانا کہ:

"اگر یہ مسلمان ہلاک ہو گئے تو پھر کبھی تیری بندگی نہیں کی جائے گی۔"

بظاہر ایک گستاخانہ جسارت معلوم ہوتی ہے، خدا تعالیٰ کی بندگی بھلا کس پر موقوف ہے، وہ تو قادر مطلق ہے۔ کیا وہ اپنی عبادت کے لئے ان ہی تین سو تیرہ کا محتاج تھا؟ معاذ اللہ! لیکن پھر حضورؐ نے یہ کیا

فرمایا، کیا یہی آداب بندگی ہیں؟۔

جواب یہ ہے کہ حضورؐ پر اس وقت بندگی اور ناز کی دو مختلف کیفیتیں طاری تھیں۔ بندگی اور ناز نے جھکا دیا، ادائے ناز زبان مبارک سے گویا ہوئی کہ مولا تیرے محبوب نے تیرہ سال کی محنت کے بعد یہ مٹھی بھر جماعت تیار کی ہے تاکہ تیرا نام بلند ہو، اگر یہ جماعت مٹ گئی تو پھر اتنی محنت کون کرے گا، مکہ کا وہ آزمائشی دور کس طرح واپس آئے گا اور آج کی فتح کے بعد پھر کفر کی بڑھی ہوئی ہمت کیسے پست ہوگی۔

عام حالات میں اگر کوئی اپنی قربانی اور نیکی پر ناز کرے تو معتوب ہو جائے۔ لیکن یہ حق صرف محبوب خدا ہی کو حاصل تھا کہ مولیٰ کے حضور میں اتنی بڑی بات کہدیں۔

راقم نے اسی کو "مقامِ ناز" سے تعبیر کیا ہے۔

اب صدیق اکبرؓ کی حالت پر غور کیجئے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے لپٹ جانا ایک غلام کا یہ ادب کا کون سا طریقہ ہے؟ یہ تو گستاخی ہے۔

میں کہوں گا ٹھیک ہے، لیکن ابوبکرؓ اس وقت آقا کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں، آقا اپنے مولیٰ سے ناز و محبت کے ساتھ پیش اور ابوبکرؓ اپنے محبوب پر ناز و محبت سے قربان ہو رہے ہیں، جہاں قواعد و ضوابط کی بہ ہیچ نہیں، قانون کی پرواہ نہیں۔

بدر کے دن حضورؐ پر گریہ وزاری کی جو کیفیت طاری تھی، اس کے

متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا بیان یہ ہے:
بدر کے روز گھوڑے پر سوار ہم میں صرف حضرت مقدادؓ تھے، اس روز میں نے لشکر پر جو ایک نظر ڈالی، تو دیکھا:

وما فینا الا نائم الا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی تحت شجرۃ و یبکی حتی اصبح۔ (ابن کثیر)	ہم میں سے ہر شخص نیند میں مدہوش تھا مگر حضورؐ جاگ رہے تھے۔ آپ ایک درخت کے نیچے نماز میں مشغول تھے اور آپ پر رقت طاری تھی، یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

بالآخر خدا تعالےٰ نے اپنے رسول کو تسلی دی اور آپ فتح کی یہ پیشین گوئی سناتے ہوئے یونس کے خیمے سے باہر تشریف لائے۔

سیھزم الجمع ویولون الدبر۔ (قمر)	فوج کو شکست دی جائے گی اور وہ پشت پھیر دیں گے۔

دین کے ہادی ہیں، خدا کی مرضیات کی آخری سند ہیں۔ اعلان کر دیا گیا ہے کہ دین حق ان ہی کے اسوۂ پاک کا نام ہے لیکن زبان پر اکثر ادعات یہ دعا رہے:

یا مقلب القلوب والابصار ثبت قلوبنا علی دینک وطاعتک	اے دلوں اور آنکھوں کے پلٹنے والے ہمارے دلوں کو اپنے دین اور اپنی اطاعت پر جما دے۔

جس کی استقامت پر خود خدا کو اتنا ناز ہو کہ وہ اعلان کر دے،

"جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔"

وہ رسول ثبات و استقامت کی اس طرح دعا کرے ہے — پھر غور کیجئے:

"اپنے مولیٰ کی عظمت کے سامنے اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنا" اس کی کتنی اچھی مثال سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا میں ہے۔

• اللھم انی اعوذ بک من شر سمعی وبصری وشر لسانی وقلبی وشر منی"۔

"واعوذ بک من الکفر والفقر والفسوق والشقاق والنفاق وسوء الاخلاق وضیق الارزاق والسمعۃ والریاء"۔

جن کا وجود سراپا خیر و صلاح، جن کی کسی جسمانی یا ذہنی طاقت کا شر و فساد کی طرف مائل ہونا ناممکن، کفر و نافرمانی، بداخلاقی و ریاکاری، ان کی طرف رخ کرے؛ معاذ اللہ — لیکن پھر یہ دعا ہے — کس قدر تواضع اور عجز ہے خدا کی بارگاہ کبریائی میں۔

پھر اس التجا پر غور کیجئے:

"یاحی یا قیوم، برحمتک استغیث، لاتکلنی الا نفسی طرفۃ عین"۔

جنہیں ساری کائنات کی ہدایت کی ذمہ داری سونپ کر بھیجا وہ یہ درخواست کریں "مالک! ایک لمحہ کے لئے مجھے میرے حوالے نہ کیجیو"۔

اس دعا کے انداز کو بھی سامنے رکھئے:

اللھم انی عبدک وابن عبدک وابن امتک ناصیتی بیدک ماض فی حکمک عدل فی قضاءک۔	"خداوندا! میں خود بھی تیرا بندہ ہوں، میرا باپ بھی تیرا بندہ تھا اور میری ماں بھی تیری لونڈی تھی۔ میری گردن تیرے ہی قبضہ میں ہے میرے اندر تیرا ہی حکم جاری ہے۔ میرے معاملے میں تیرے تمام فیصلے حق بجانب ہیں یعنی میرے ساتھ جو کچھ تو کرتا ہے صحیح کرتا ہے"۔

(احمد عن ابن مسعود)

تسلیم و رضا، بندگی اور نیازمندی کا اس طرح اظہار سب سے بڑے رسول کی طرف سے خدا تعالیٰ کو کس قدر پسند آیا ہوگا۔

اس عجز و خاکساری کے باوجود پھر بھی اس کی عظمت کا حق ادا نہیں ہوا ارشاد فرمایا۔

ماعبدناک حسن عبادتک۔ حضرت شاہ غلام علی صاحب نے اپنے مکتوبات میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے اس ارشاد میں بظاہر تو نفی ہے لیکن درحقیقت طلب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مقام عبدیت میں آپ اس قدر بلند تھے کہ آپ کے ظرف عالی نے عبودیت کے جام پر جام پی جانے کے بعد بھی فرمایا کہ مولیٰ! ابھی اور گنجائش ہے اور عطا ہو، ابھی پیاس باقی ہے اور پلا۔

شاہ صاحب نے منصور اور بسطامی کے اقوال، انا الحق اور

سبحان ما اعظم ثانی، اور سرور عالم میں فرق ظاہر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ان ظرف چھوٹے تھے، چھلک گئے، لیکن حضور کا ظرف اتنا وسیع تھا کہ سب سے زیادہ پی جانے کے بعد بھی یہی طلب جاری رہی کہ مولیٰ اور عطا فرما۔

حضرت امیر خسرو نے کیا خوب کہا ہے۔

گر ہمہ مردم و ملک، خاک شوند بدوات
دامن عزت ترا، گرد زوال کے رسد

قوی امروہوی نے ترجمہ کیا ہے۔

دامن عزت وجاہ تک پہنچے ترے یہ ہے محال
ہو کے فنا تمام خلق، گرد زوال ہو تو کیا

مولینا روم فرماتے ہیں: ؎

سید و سرور محمد نور جاں ٭ مہتر و بہتر شفیع عاصیاں

مرتبہ یہ تھا ـــــ اور بندگی کا حال یہ تھا کہ:

اندریں جا آفتاب انوری ٭ خدمت ذرہ کند چوں چاکری
ایں تماباور نیاید مصطفےٰ ٭ چوں ز مسکیناں ہمی جوید دعا

یعنی وہ آفتاب عالم تاب تھے مگر ذروں کی خدمت کرتے تھے مراد ذروں سے صحابۂ کرام ہیں، نیز کون باور کر سکتا ہے کہ وہ حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم مساکین سے اپنے لئے دعاء کرایا کرتے تھے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

حاصل یہ نکلا کہ رسولوں کو جو کچھ ملا ہے وہ دراصل "عبدیت کا صلہ" ہے جس کا اعلان واظہار ہر نبی نے قدم قدم پر کیا ہے۔

وجہ ظاہر ہے کہ لوگ رسولوں کی عظمت کو دیکھ کر کہیں خدا یا خدا کا اوتار نہ کہنے لگیں بلکہ یہ سمجھیں کہ نبی اونچے سے اونچا مقام رکھ کر بھی ایک بندہ خدا ہے اور اس کا رسول ہے۔

مزید وضاحت کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کے سردار نبیوں کے امام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک "عظیم مرتبہ" پر روشنی ڈالدی جائے اور اسی کے ساتھ یہ بتلا دیا جائے کہ اس عظیم رسول کا یہ عظیم درجہ بندگی کے ساتھ کتنا گہرا تعلق رکھتا ہے۔

اور پھر قارئین آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ اگر امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اس عظیم وجلیل روحانی مقام پر فائز ہو کر بھی ایک "بندہ" ہیں تو پھر کسی دوسرے نبی کے کسی کمال کو دیکھ کر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ نبی خدا کا بیٹا یا خدا کا اوتار ہے۔

••

بندگی کی معراج

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

معراج نام ہے عالمِ قدس کی اس معجزانہ سیر و سیاحت کا جس میں آمد و رفت اور رویت و سماعت کے تمام مادی قوانین منسوخ کر کے معبودِ برحق نے عبدِ کامل کو اپنے قربِ خاص میں بلایا۔

یہ عالمِ روحانیت کا وہ عظیم الشان تجربہ ہے جس کے ذریعہ عالمِ غیر محسوس کے سربستہ راز عالمِ محسوس کے رہنے والوں پر کھول دیئے گئے۔

اس سفر میں جہاں نوعِ انسانی کے معلم کو علم و عرفاں کے انتہائی عروج پر پہنچا یا گیا وہاں آپ کے توسط سے اولادِ آدم پر بھی الٰہی مصلحتوں کے دروازے کشادہ ہوئے۔

اس سفر میں مبصرِ عالم نے عجائباتِ کائنات کا مشاہدہ کیا۔ خیر و شر کے

بشیر و نذیر نے نتائجِ اعمال کی مثالی شکلیں دیکھیں۔ خلیفۃ اللہ نے انتظامات عالم کی حکمت کے مختلف گوشوں کا علم حاصل کیا۔

اس کے لئے، جو بارہ سال تک راہ حق میں اپنوں اور پرایوں کے ظلم سہتا رہا، عالمِ قدس کے جلوے عام ہوئے۔

اس کے استقبال میں ملاء اعلیٰ نے آنکھیں بچھائیں جس کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے رہے، صرف اس لئے کہ وہ راہ حق کا مسافر تھا۔

آسمان و زمین نے اپنے مخفی نظارے اس کے سامنے بے نقاب کر دیئے۔ کیونکہ اسے دنیا میں خدائے ارض و سما کی مرضیات قائم کرنے کا فریضہ سرانجام دینا تھا۔

وہ آنکھیں تجلیات ربانی سے معمور ہوئیں جو اولاد آدم کی گمراہی پر خون کے آنسو رویا کرتی تھیں۔

وہ دل توجہات خصوصی سے مسرور ہوا جو ابنائے آدم کی بے راہی پر درد سے تڑپا کرتا تھا۔

جو زمین والوں کو خدا کے طور و طریق سکھانے پر مامور تھا اس کے سامنے کرو بیان ملاء اعلیٰ اپنی اپنی عبادات کی مختلف شانوں اور اداؤں کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیش ہوئے۔

جس نے آکر رسولوں کے دامن سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کے داغ دھبے صاف کئے اور ان کی شان بڑھائی۔ اس محسن کا ہر منزل سفر پر ان رسولوں نے خیر مقدم کرایا اور ان ہی کے ہاتھوں اس کے سر پر امامت کا

تاج رکھوایا۔

ابن آدم کی حقیقی عظمت کا اعلان ہوا۔ جب فرشتوں کا سردار اپنی کمزوری کا اعتراف کر کے سفر کی ایک منزل پر تھک کر رہ گیا اور فخرِ آدم قربِ الٰہی کی نورانی فضاؤں میں آگے بڑھتا چلا گیا اور وہاں پہنچا جہاں ؎

عشق حق آمد سراپا حق شود

کی جلوہ آرائیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

فکان قاب قوسین او ادنیٰ۔

معراج کا مقصد

اس سفر کا حاصل کیا تھا؟ —— اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس ملاقات میں نوعِ انسانی کی فلاح و سعادت کا جو انقلاب انگیز پیغام آپ کو عطا ہوا وہ ساری روداد سفر کی جان ہے اور وہی مقصد معراج کہلانے کا مستحق ہے —— فاوحیٰ الیٰ عبدہ ما اوحیٰ —— میں اسی پیغام کی طرف اشارہ ہے جس کی مختصر تفسیر اقبال کا یہ شعر ہے۔ ؎

چناں بانہ آمدن از لامکانش
وردِ سینۂ او در کفِ جہانش[1]

---

[1] سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے بھی اپنے ایک مضمون میں واقعۂ معراج کا حاصل صرف یہ بتایا ہے کہ مکہ کی زندگی قریب الختم اور مدینہ کا دور شروع ہونیوالا تھا (باقی ص ۲۸)

یعنی اخلاق و روحانیت کی بے حساب دولت سینہ میں اور عدل و سیاست کی عالمگیر طاقت ہاتھ میں لیکر واپس لوٹے۔

اس پیغام کے ساتھ ساتھ معجزانہ سفر سے ایک دوسری حقیقت کا اظہار بھی مقصود تھا اور وہ یہ بتانا تھا کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک "عبدیت" کا مقام کیا ہے؟

آزمائش کے بارہ سال

اسے سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ان حالات پر ایک نگاہ ڈال لیجئے جن سے سرورِ عالمؐ اور آپ کے رفیقؓ گذر رہے تھے۔

عام روایات کے مطابق معراج کا واقعہ ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے پیش آیا یعنی نبوت کے بارھویں سال ــــ یہ بارہ سال آپ پر کس طرح گذرے؟

(بقیہ حاشیہ صـ۲۷) آنحضرتؐ کے سامنے خلافت ارضی کے تاج و تخت تھے اور عدل و سیاست کی کنجیاں آپ کو سپرد کی جانے والی تھیں معراج میں قربِ خداوندی کا مقصد یہی تھا کہ اس حکومت سازی اور ملک گیری کے سلسلے میں حاکم حقیقی آپ کو وہ کچھ دینا چاہتا تھا جس کا اس سلسلہ میں دیا جانا ضروری تھا مگر ہم اسے معراج کی برکات میں سے صرف ایک برکت سمجھتے ہیں۔ صحیح نقطۂ نظر اس سلسلہ میں وہی ہے جو اس مضمون میں مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی نے پیش کیا ہے کہ معراج آنحضرتؐ کی عقیدت کاملہ کی قبولیت اور اس کے شایانِ شان ایک انعام تھا جو بارگاہ خداوندی سے آپ کو عطا کیا گیا۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس انعام میں کیا کچھ برکتیں اور کیا کچھ نعمتیں امت اور صاحب امت کے لئے موجود تھیں۔
(سید محمد اظہر شاہ قیصر)

بڑی حوصلہ شکن مخالفتوں میں گذرے، نہایت صبر آزما مصائب میں بیتے، نہ اپنوں نے بخشا نہ پرایوں نے رو رعایت کی۔ بس کانٹوں کا راستہ تھا جو ہنسی خوشی طے کیا جا رہا تھا۔ جرم یہ تھا اور صرف یہ کہ عوام کو بڑوں کی خدائی کے طوق غلامی سے آزاد کر کے خدائے واحد کی بندگی میں لانا چاہتے تھے اور یہ کوشش تھی کہ سوسائٹی بداخلاقیوں اور بدچلنیوں سے پاک ہوجائے۔

پیغام کا خلاصہ یہ تھا کہ بندگی اور طاعت کے لئے صرف ایک ہی ذات ہے جو سب کی مالک ہے۔ خالق ہے رب ہے ـــــ زندگی کی ہر ضرورت میں ـــ رزق میں، اولاد میں، صحت میں، سلامتی میں ـــــ سب اسی کے مرہون منت ہیں۔

کائنات پر اسی کا اقتدار ہے، سب اس کے محکوم اور تابع امر ہیں۔ بڑائی اور کبریائی اسی کے لئے ہے۔ سب اس کے سامنے ذلیل، محتاج اور اس کے دست نگر ہیں۔

ہم پر صرف بندگی پھبتی ہے، آقائی تو اسی کو زیب دیتی ہے۔

یہ دعوتِ انسانیت کے لئے پیغام حیات تھی لیکن نفسانیت اور شیطنت کے لئے پیامِ اجل ـــــ اس لئے بندگانِ نفس نے اسے ناکام بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا۔ "باپ دادا کے دین کو بچاؤ" کا نعرہ صرف بزرگوں کے نام کی آڑ تھی ورنہ اصل خطرہ ان کے اپنے اقتدار کے لئے تھا۔

واذا قیل لہ اتق اللہ اخذتہ العزۃ بالاثم۔ (بقرہ)	اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈر تو آمادہ کرے اس کو غرور گناہ پر۔

جب ان ربّانی قوم کو حق کی بڑھتی ہوئی طاقت سے انقلاب کا اندیشہ محسوس ہوا تو وہ دولت و ثروت کے تیر، اثر و رسوخ کی تلواریں، مذہبی اجارہ داری کی بندوقیں اور بم لیکر نکل آئے اور جاہل عوام کو لات و عزیٰ کے نام کی غیرت دلا کر ان کے ہاتھ میں "دینِ آباء کی عزت" کا جھنڈا دیکر دینِ حق کے داعی اور اس کے کمزور ساتھیوں کے ساتھ صف آرا کر دیا۔

ادھر سے الزامات کی بوچھاڑ، تہمتوں کی بارش، مار پیٹ، گالم گلوچ، معاشی اور سماجی بائیکاٹ، اور ادھر سے عفو و درگذر، اخلاق و شرافت، دعائیں اور درخواستیں، محبت اور ہمدردی، شفقت اور خدمت اور پورے عزم و استقامت کے ساتھ دعوت الی الحق۔

خذ العفو و أمر بالمعروف و اعرض عن الجاھلین۔

ایک دو برس نہیں کامل بارہ برس تک جب بندے کی بندگی، نیازمندی اور تسلیم و رضا کا پورا مظاہرہ ہو چکا اور ایک کو نہیں ——— ایک ایک بندۂ عشق کو اچھی طرح پرکھ لیا گیا تو بندۂ کامل کے پاس دربارِ خاص کا بلاوا آ پہنچا۔

از بلاہا پختہ تر گردد خودی ٭ تا خدا را پردہ در گردد خودی

در رہِ حق ہر چہ پیش آید نکوست ٭ مرحبا نامہربانی ہائے دوست

دستورِ محبت

اس کے حضور بلندیاں اسی کو عطا ہوتی ہیں جو اس کی محبت میں ہر قسم کی پستیوں کو خوش آمدید کہتا ہے۔

من تواضع اللہ رفعہ اللہ

راہِ حق کے خاک نشیں ہی دربارِ حق میں اونچی جگہ پاتے ہیں۔

ورفعنا لک ذکرک

جو عشق حق میں سب کچھ لٹا دیتا ہے اسی کے سامنے دولت دارین کے خزانے پیش کئے جاتے ہیں۔

من کان للہ کان اللہ لہ

ساتھ ہو میرے اگر تم پھر تو دنیا ساتھ ہے

جو جرأت اعلائے حق میں کسی کی ناراضگی کی پرواہ نہیں رضائے الٰہی کے سدا بہار پھول اسی پر نچھاور ہوتے ہیں۔

ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ

چوں فنا اندر رضائے حق شود
بندۂ مومن قضائے حق شود

جو راہ حق کی سختیوں میں مبتلا ہوتا ہے انجام کار کی آسانیاں اسی پر کھلتی ہیں۔

وللآخرۃ خیر لک من الاولیٰ

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا!

معراج اسی حقیقت کا اعلان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سیر ملکوت واسریٰ کی ابتدا بھی عبدیت کے عنوان سے ہوئی ــــ اسریٰ بعبدہٖ ــــ اور انتہا بھی اسی عنوانِ عبدیت سے ــــ فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ ــــ

عبدیت

اہل حق را رمزِ توحید از بر است

در آتی الرحمٰن عبداً مضمر است

"عبدیت" بندگی واطاعت، کامل عشق ومحبت کے ساتھ۔یہی رمزِ توحید ہے اور اسی میں انسانی ترقی کا کمال پوشیدہ ہے۔برتری اور برگزیدگی فضیلت اور عظمت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ عبدیت کا انتہائی مقام ہے۔

خدا تعالیٰ کے نزدیک اچھے بندوں کی مقبولیت، اور محبوبیت کے اظہار کے لئے سب سے اچھا یہی لفظ ہے اور یہی اعزاز واکرام کا سب سے اونچا خطاب ہے۔

حضرت نوحؑ کی تکذیب کی جاتی ہے، سرکش دست درازی پر اتر آتے ہیں تو نوح کی اس مظلومانہ حالت کو بیان کرتے ہوئے ـــــ فکذبوا عبدنا ـــــ کہا جاتا ہے ـــــ یعنی کسی غیر کی نہیں ہمارے بندے کی تکذیب کی۔اس میں سرکشوں کے لئے تنبیہہ اور مظلوم نوح کے لئے قبولیت کا نہایت سکون بخش پیغام تھا۔

باطل کی تباہی اور حق کی کامیابی پر نوح کی شکرگذاری خوف ومسرت کے جذبات کے ساتھ ایک عبد کامل ہی کا کام تھا۔

انہ کان عبداً شکورا

حضرت ایوب علیہ السلام، وہ صبر و رضا کا پیکر، تسلیم و اتقیاد کا مجسمہ

خدا کا "بڑا اچھا بندہ" تھا اور اس کی ساری اچھائیاں "عبدیت" ہی کی مرہون منت تھیں۔

نعم العبد انہ اواب

حضرت داؤد اور حضرت سلیمان ــــ علم و نبوۃ کے ساتھ دولت و حکومت بھی بخشی گئی۔ حکومت کا نشہ مغرور بنا دیتا ہے، ظلم و ستم پر آمادہ کر دیتا ہے، مگر انہوں نے شوکت و حشمت کے باوجود بھی بندگان الٰہی کی خدمت کی اور ایسی آقائی کا نمونہ پیش کیا جس میں بندگی کے تمام اعلیٰ اوصاف موجود تھے۔ یہ صرف اس لئے کہ داؤد بھی "عبد" تھے۔

واذکر عبدنا داود ذاالاید

اور اس باپ کے بیٹے سلیمان بھی "عبد" تھے۔

ووھبنا لداود سلیمان نعم العبد انہ اواب

حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر ــــ صاحب کتاب اور صاحب جہاد ــــ جس مرشد کامل کی تلاش میں نکلے وہ کون تھا؟ ــــ وہ صرف ایک بندۂ حق تھا۔ بندگان حق میں سے، جو خدا تعالیٰ کی خصوصی رحمت و عنایت کا مورد اور علم لدنی کی دولت کا سرمایہ دار ہونے کے باوجود ایک بندہ اور صرف ایک بندہ تھا۔

فوجد عبدا من عبادنا اتیناہ رحمۃ من عندنا و علمناہ من لدنا علما۔

حضرت لوط اور حضرت ہود علیہما السلام بھی "خدا کے بندے" تھے اور یہی

ان کی وہ خصوصیت تھی جس نے انہیں اپنے عہد کا ممتاز ترین انسان بنادیا تھا۔

کانتا تحت عبدین من عبادنا صالحین

حضرت ذکریا علیہ السلام ـــــ بنی اسرائیل کے ایک صاحب عظمت پیغمبر ـــــ رحمت کردگار نے نوازا۔ بڑھاپے میں اولاد ہوئی۔ وحیِ الٰہی نے بتایا کہ یہ سب کچھ ان کی عبدیت کا طفیل تھا، ان کی تسلیم ورضا کا نتیجہ تھا۔

ذکر رحمۃ ربک عبدہ زکریا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے صاحبِ اعجاز پیغمبر ـــــ جن کی پیدائش توالد و تناسل کے فطری قانون کا ایک حیرت انگیز استثنار اس لئے وہ ایک بہت بڑی کمزوری سے پاک ہوگا اس کے باوجود وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک بندہ اور خداتعالیٰ کے سامنے ایک بے اختیار اور عاجز بندے

ان ھو الا عبد انعمنا علیہ

وجعلناہ مثلاً لبنی اسرائیل

جس کے وہ اس وقت سے اقراری جب وہ ایک طفل شیر خوار تھے اور جھولے میں پڑے جھولتے تھے۔

قال انی عبد اللہ اتانی الکتاب

یہ اپنی عبدیت پر اظہار فخر ہے اور عجائب پرستوں کو سخت تنبیہ اور ان کے خیالات فاسدہ کی تردید۔

اب لیجئے رسولوں کے سردار فخر انبیار کو۔ یہ سب سے برتر تھے، سب سے زیادہ فضیلت مآب تھے، اس لئے یہ بندگی میں سب سے آگے تھے۔

عبدیت میں ان کی کوئی مثال نہ تھی۔ آپ نے دنیا کو عبدیت کا درس دیا، بندگی کے آداب سکھائے، اپنی عبدیت کامل تھی اس لئے عبدیت کی تربیت میں مربی کامل کا مقام پایا۔

آغازِ کار سے لیکر انجام کار تک اپنے آپ کو اس حیثیت سے پیش کیا حبیب تھے، خلیل تھے، لیکن نبوت کے ساتھ صرف عبدیت کی عاجزی اور تواضع کا وصف لگایا، بلکہ نبوت سے بھی اسے مقدم رکھا۔

اشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ

قرآن جیسی باعظمت کتاب لیکر سامنے آئے۔ جس کے علومِ ہدایت نے ضلالت پسندوں کو عاجز کر دیا اور سب نے ـــــ قانون کے ماہروں نے ـــــ فلسفہ وحکمت کے فاضلوں نے ـــــ شعر وسخن کے شہنشاہوں نے ـــــ تاریخ کے عالموں نے ـــــ صاحب قرآن کے علم وتدبر کا لوہا مان لیا۔ لیکن خدا کی طرف سے تعارف ہوا تو صرف "عبدیت" کے ساتھ ہوا۔

(۱) الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ الکتاب۔

(۲) ھو الذی ینزل علی عبدہٖ آیات بینات۔

(۳) تبٰرک الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہ۔

قرآن جیسی سچی، ہدایت اور سعادت کے کامل اصول رکھنے والی کتاب کے بارے میں ابن عبداللہ کی تصنیف کہنے والوں کو چیلنج کرتے ہوئے بھی داعی قرآن کو صرف "عبد" (بندہ خاص) کہہ کر ہی پیش کیا۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ۔

آپ رات کے سناٹے میں قرآن پڑھنے کھڑے ہوتے ہیں، تاثیر و کشش کا یہ عالم ہوتا ہے کہ لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے ہیں۔ یہ دلوں کو کھینچنے والا کون ہے۔ یہ کوئی جادو بیان مقرر ہے، یہ ایک ایسا نذیر ہے جس کی ایک للکار سے گناہگاروں کے دل دہل جاتے ہیں، شر و فساد کی بنیادیں ہل جاتی ہیں، یہ ایک ایسا بشیر ہے جس کی زبان سے پیغام بشارت سنکر نیکوں کی آنکھوں کے سامنے جنت اور سایہ عرش کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ کلام بھی ایسا اور متکلم بھی ایسا، اس کی صفت کو ظاہر کرنے کے لئے شاندار سے شاندار الفاظ استعمال ہونے چاہئیں تھے لیکن صفت وہی بیان فرمائی جو خدا کو سب سے زیادہ پیاری تھی۔ وہ ہے "عبدیت"۔ فرمایا۔

وانہ لما قام عبد اللہ یدعوہ کادوا یکونون علیہ لبدا۔

وہ ہر وقت بندہ تھا، اس کی ہر ادا میں بندگی تھی لیکن اس کی بندگی کا رنگ اس وقت بالکل نکھر کر سامنے آجاتا جب وہ نماز کے قیام میں اپنے آقا کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا رکوع میں سر جھکاتا اور سجدہ میں اپنی پیشانی کو خاک پر رکھ دیتا۔

ارایت الذی ینھی عبدا اذا صلے۔

اس کی تشریح آپ نے ان الفاظ میں فرمائی:

"بندہ سجدہ کی حالت میں اپنے رب سے جتنا قریب ہوتا ہے اتنا کسی حالت میں نہیں ہوتا"

اس قرب کو سمجھانے کے لئے بس معراج ہی کی ایک مثال ہو سکتی تھی اس لئے فرمایا:

الصَّلٰوۃ معراج المؤمنین

اقبال مرحوم نے اس کے لئے "سوزِ حیات" کی شرط لگائی ہے۔ یعنی رسمی نماز نہیں، حقیقی نماز مراد ہے۔ ؎

در بدن داری اگر سوزِ حیات
ہست معراجِ مسلماں در صلوٰت

توہم پرست داعی اسلام کو ڈراتے ہیں، اگر ہمارے بتوں کی مخالفت کی تو غضب ہو جائے گا، ان کے تقدس کی مار پڑ جائے گی۔ اس پر اپنے رسول کو ساری کائنات سے بے نیازی کا سبق دیکر اپنی کفایت کا یقین دلاتے ہیں۔ لیکن یہ بتا دیتے ہیں کہ یہ بات صرف عبدیت کے لئے خاص ہے۔ تم ہمارے خاص بندے ہو اس لئے مادی سامان کچھ بھی نہ ہو، صرف ہماری ذات تمہارے لئے کافی ہے۔

الیس اللّٰہ بکاف عبدہٗ

پھر یہ کفایت بھی دور بیٹھ کر نہیں بلکہ بندہ کے ہاتھ پاؤں بن کر پوری کی جاتی ہے اور یہ عبدیت کا انتہائی کمال ہے۔ ؎

لا اللہ تیغ و دم او عبدہٗ	فاش تر خواہی بگو ھو عبدہٗ
مدعا پیدا نہ گردد زیں دو بیت	تا نہ بینی از مقامِ "ما رمیت"

اسی خصوصیت کے ساتھ کتبِ سابقہ میں بھی آپ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

دارمی نے حضرت کعب سے اور طبرانی اور ابو نعیم نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ سرورِ عالم نے فرمایا:

"توراۃ نے ان اوصاف کے ذریعہ میرا تعارف کرایا ہے:"

عبدی احمد المختار مولدہ بمکۃ ومہاجرہ بالمدینۃ، امتہٗ الحمادون للہِ علی کل حال۔ (شرحِ شفاء ص ۱۶۱)

جو وصف سب میں ممتاز اور اول نظر آرہا ہے وہ عبدیت خاصہ (میرا بندہ) ہے۔

پس جب فخرِ انبیاء عبدیت کے سب سے اونچے مقام پر فائز تھے تو خدا تعالیٰ نے بھی آپ کو قرب و وصال کا وہ انتہائی شرف بخشا جو کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوا اور یہیں پہونچکر عبد کامل پر اس کا مقام عبدیت آشکارا ہوا۔

تا نہ "مازاغ البصر" گیرد نصیب
بر مقامِ "عبدہٗ" گردد رقیب

نبی اور مصلح میں فرق

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا تعالیٰ نے ہر قوم کی ہدایت کے لئے ہر دور میں نبی اور رسول بھیجے تا کہ وہ بھٹکے ہوؤں کو صحیح راستہ بتائیں۔

(۱) ولکل قومٍ ھاد۔ "ہر قوم کے لئے ہدایت کرنے والے آئے۔"
(القرآن الکریم)

(۲) وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر۔ "کوئی امت ایسی نہیں جس کے پاس کوئی ڈرانے والا نہ پہنچا ہو۔"

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ رسالت اور نبوت کا منصب اتنا عام ہے کہ نہ اس کے لئے کچھ شرائط و لوازم ہیں اور نہ اس منصب کے لئے روحانی اور علمی، عملی اور اخلاقی صلاحیت کی ضرورت اور نہ ہی فطری امتیاز و خصوصیت کا کوئی خاص معیار مقرر ہے۔

صاحب شوکت بادشاہ انسانوں کے درمیان امن و امان قائم کرتے ہیں

فلاسفر انسانی اعمال وخیالات کے اسباب وعلل کی تحقیقات کرتے ہیں۔ حکیم اور مصلح نہایت شیریں کلامی سے حکمت کی باتیں کرتے ہیں۔ سحر البیان خطیب اپنی خطابت سے لوگوں کے دل موہ لیتے ہیں لیکن وہ پیغمبر نہیں ہوتے اور نہ انہیں نبی و رسول کہا جا سکتا ہے۔

نبی اور رسول جیسے مقدس الفاظ کا یہ کتنا غلط استعمال ہے کہ جس نیک انسان نے اپنی نیکیوں کی کشش یا قربانیوں کے اثر سے کچھ لوگوں کو اپنے پاس جمع کر لیا، یا جس لیڈر نے چند نعروں سے فضا کو گرما کر مظلوموں کی ایک بھیڑ اکٹھی کر لی، یا جس رحم دل اور درد مند انسان نے نفرت، تعصب اور تنگ نظری میں گھری ہوئی قوم سے خدا ترسی، محبت اور سچائی کی چند باتیں کہہ دیں اسے اس کی خدمات پر خراج تحسین ادا کرتے ہوئے نبی اور رسول کہہ دیا، یا یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ بھی انہیں مقدس انسانوں میں سے ہے جو انسانوں کی ہدایت کے لئے خدا کی طرف سے مبعوث ہوتے ہیں، یہ نبوت اور رسالت کی حقیقت سے لاعلمی کا ثبوت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ ہر سحر البیان خطیب اور خیال آرا شاعر رسول ہو سکتا ہے اور نہ ہر نکتہ داں حکیم، نہ ہر ماہر اسرار کائنات فلسفی، نہ ہر تارک دنیا صوفی، نہ ہر کامیاب منتظم لیڈر، نہ ہر امن واماں اور محبت واتحاد کا پیامی نبوت اور رسالت کی نازک ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالنے کی اہلیت لیکر پیدا ہوتا ہے۔ وہ ریفارمر اور مصلح ہو سکتا ہے، نبی اور رسول نہیں ہو سکتا۔ یوں تو نبی بننے کے بعد نبی اپنے علم وعمل، طریق کار اور مقصد کے لحاظ

سے سب سے نمایاں اور ممتاز ہوتا ہے۔ لیکن نبوت سے قبل ہی اس کی زندگی میں خیر و برکت کے وہ آثار ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں جو کسی دوسرے کی زندگی میں ممکن نہیں۔

انسان کی علمی اور عملی کوششیں اور قربانیاں اور بنی نوع انسان کی ہمدردی، انسان کو مصلح اور ریفارمر کے منصب پر فائز کر سکتی ہے لیکن نبوت کا مقام انسانی کسب و عمل سے بالاتر ہے۔ وہ ایک خالص خدائی عطیہ ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے صرف ان ہی لوگوں کو عطا کیا جاتا ہے جن میں فطرتاً اس منصب کی اہلیت رکھی جاتی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جو حضرات خدا کی طرف سے اس منصب پر فائز ہوئے وہ بچپن ہی سے صفات عالیہ کے متصف رہے اور ان کا وجود ہر موقع پر منبع خیر و برکت ثابت ہوا۔ وہ اپنے حسب و نسب، صورت و شکل، امانت و دیانت، پاک نفسی اور برائیوں سے طبعی نفرت کے لحاظ سے اپنے ماحول میں ایسے رہے جیسے اندھیرے میں اجالا۔ وہ عالم وجود میں قدم رکھتے ہی لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے، ان کے کردار کا دور دورہ اور شہرہ ہوا۔ ان کے فہم و فراست نے نوعمری میں ہی بڑے بڑے عقلمندوں کو اپنے سامنے جھکا لیا۔ انہوں نے نبوت ملنے سے قبل ہی اپنی خدمات پر لوگوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ وہ "امین" کہلائے اور وہ جوں جوں آگے بڑھتے گئے ان کی استعداد اور فطری صلاحیت کا جوہر برگ و بار لاتا رہا۔

اور یہ اس لئے ہوا کہ جب ایک پیغمبر اصلاح قوم کے لئے میدان میں

آئے تو سب سے پہلی دلیل اس کی صداقت پر اس کی اپنی سابقہ زندگی ہو اور اس میں لوگوں کے لئے تصدیق کا پورا پورا سامان موجود ہو۔

انبیاء علیہم السلام کی نبوت سے پہلے کی زندگی کے حالات و واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں، ان کا مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ ایک رسول کی پرورش، تربیت اور چالیس سال کے واقعات زندگی میں خدا تعالےٰ کی خصوصی نگرانی شامل ہوتی ہے اور اس کی زندگی میں آنے والے دور کے آثار و نشانات پوری طرح موجود ہوتے ہیں اور ان میں نبی کا مستقبل پوری طرح جھلکتا رہتا ہے۔

اس حقیقت کی تصدیق انبیاء علیہم السلام کی زندگی کے حسب ذیل واقعات سے ہوتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت ابراہیم ایک ایسے ماحول میں آنکھیں کھولتے ہیں جس میں مخلوق پرستی کا دور دورہ ہے، بابل اور نینوا کی عظیم الشان قومیں چاند، سورج اور ستاروں کے سامنے سربسجود ہیں، بت پرستی اور شرک محض ایک مذہبی عقیدہ ہی نہیں بلکہ قوم کی معاشی، تمدنی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کا سارا نظام اسی عقیدہ پر قائم ہے، پانچ ہزار چھوٹے بڑے مصنوعی خداؤں کی عبادت گاہوں میں روزانہ لوگ صبح و شام جمع ہوتے ہیں، شرک کا باقاعدہ نظام قائم ہے، ملک کے مختلف شہروں کے الگ الگ خدا ہیں، اور

دارالخلافہ (اُر) کا ایک سب سے بڑا دیوتا (مہادیو) ہے جسے ننّار (چاند دیوتا) کہتے ہیں۔ یہ محض مذہبی دیوتا نہیں ہے بلکہ ملک کا سب سے بڑا زمیندار ہے۔ سب سے بڑا تاجر ہے، سب سے بڑا کارخانہ دار ہے اور ملک کی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا حاکم ہے، اس کے مندر کے لئے بکثرت باغ، مکانات اور زمینیں وقف ہیں، مندر کے ماتحت بہت سے کارخانے قائم ہیں اور ان سب کا انتظام مندر کی طرف سے پجاری کرتے ہیں، جو شاہی خاندان حکومت کرتا ہے وہ بھی اس دیوتا کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے اور اس تعلق کی وجہ سے بادشاہ بھی دیوتاؤں میں شمار ہوتا ہے۔

خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ماں باپ بت تراش اور بت فروش ہیں، ہر شخص اس مشرکانہ نظام میں اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ اس کے خلاف سوچنا بھی ناممکن ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے پھیلے ہوئے اور جمے ہوئے.. .. .. .. نظام کی مخالفت زندگی کے پورے ڈھانچے میں انقلاب برپا کرنے کے مترادف ہے اور زندگی کی ساری عمارت کو گرا کر اسے از سر نو بنانے کی دعوت ہے جس کے لئے ایک مادہ پرست قوم کا تیار ہونا کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن ایک نوجوان ہے جو پوری قوم میں تنہا اس بات پر غور کر رہا ہے کہ کیا یہ بے اختیار مخلوق بھی نفع و نقصان، حیات و موت اور خوشحالی و بدحالی کی مالک ہو سکتی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش سے متنفر ہے اس کے چاروں طرف اندھیرا ہے اور کسی طرف روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں پڑتی جو حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکے مگر اس کے

باوجود وہ تلاش حق میں سرگرداں ہے کیونکہ اس کے دل میں سچائی کا وہ نور موجود ہے جو آگے چل کر اس اندھیرے کو دور کرنے والا ہے۔ پس اس کا طبعی جوہر اس کی رہنمائی کرتا ہے اور وہ آثار کائنات میں چاند، سورج، ستاروں سے اپنی جستجوئے حقیقت کا آغاز کرتا ہے۔

ایک روز جب شام ہوئی اور زہرہ ستارہ اپنی ساری درخشانیوں کے ساتھ پردۂ شب سے جھانکا تو اس کے ذہن میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔

اس نے اپنی قوم کے عقیدہ کو نقل کرتے ہوئے کہا، کیا یہ چمکدار ستارہ میرا پروردگار ہے؟ کیونکہ میری قوم اسی تمثالی بت کی پوجا کرتی ہے۔ اسی سوال کا جواب اس نے اپنی تحقیق سے طلب کیا۔ وہ غور کرتا رہا۔ لیکن جب وہ ستارہ تھوڑی دیر کے بعد ڈوب گیا تو اس کی تحقیق نے اسے جواب دیا کہ جو ہستیاں ڈوب جانیوالی ہیں وہ پروردگار نہیں ہو سکتیں۔

پھر پردۂ ظلمت چاک ہوا اور چاند چمکتا ہوا نکل آیا۔ پھر اس نے سوال کیا، کیا یہ میرا پروردگار ہے؟ لیکن وہ بھی نہ ٹک سکا اور غروب ہو گیا۔ اب صبح ہوئی اور آفتاب جہاں تاب نے پردہ شب کا نقاب الٹ کر عالم کائنات پر اپنی کرنیں ڈالیں۔ یہ سب سے بڑا تھا۔ لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو وہ نوجوان پکار اٹھا کہ ان میں سے کوئی بھی میرا پروردگار نہیں ہو سکتا۔ یہ سب زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ ہم مختار نہیں، بے بس مخلوق ہیں اور قدرت کے ایک مقررہ قانون کے ماتحت گردش کرتے رہتے ہیں۔

پس جو خود محکوم و پروردہ ہو وہ حاکم و پروردگار کیسے ہو سکتا ہے۔

اس نوجوان نے اعلان کیا:

"اِنّی وجهت وجهی للّذی فطر السمٰوات والارض حنیفاً وما انا من المشرکین۔"

"میں ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف اس ہستی کی طرف رخ کرتا ہوں جو کسی کی بنائی ہوئی نہیں بلکہ زمین و آسمان کی خالق ہے، اور میں صاف کہتا ہوں کہ میں ان میں سے نہیں ہوں جو اس کے ساتھ اس کی مخلوق کو شریک کرتے ہیں۔"

یہ غور و فکر اور حق کی تلاش و جستجو اور منزل مقصود تک رسائی اسی فطری جوہر کا نتیجہ تھا جو ایک ہونے والے رسول میں ودیعت کیا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق قرآن حکیم نے واضح طور پر یہ فرمایا ہے۔

ولقد اٰتینا ابراھیم رشدہٗ من قبل و کنا بہٖ عالمین۔	"بلاشبہ ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے رشد عطا کیا تھا، اور ہم ان کو اچھی طرح جانتے تھے۔"

"رشد" کیا چیز ہے؟ قرآن میں یہ غَیّ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ غَیّ کے معنی گمراہی کے آتے ہیں، اس لئے اس کے معنی ہوں گے "راہ راست پر قائم رہنا، سیدھی راہ چلنا۔"

سورۂ حجرات میں "راشدون" کی تفسیر کرتے ہوئے خود قرآن نے رشد کے مفہوم پر روشنی ڈالی ہے:

واعلموا ان فیکم رسول اللّٰہ	"اور جان لو کہ تم میں اللہ کے رسول

لو یطیعکم فی کثیر من الامر لعنتم ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان ط اولئک ھم الراشدون ط

(القرآن الکریم)

ہیں۔ بالفرض اگر یہ بہت سی باتوں میں تمہارا کہا ماننے لگیں تو بلاشبہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ، لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو اس مشقت سے اس طرح بچایا کہ ایمان اور اطاعت کو تمہارے دلوں میں محبوب اور مرغوب بنا دیا اور کفر وفسق اور معصیت کی نفرت تمہارے دلوں میں ڈال دی، ایسے ہی لوگ رشد وہدایت والے ہیں۔

معلوم ہوا کہ نبی منصبِ نبوت پر باقاعدہ سرفراز ہونے سے پہلے صدیق و ولی ہوتا ہے، اس میں حق کا عرفان موجود ہوتا ہے، وہ معرفت حق کے معاملہ میں ہر قسم کے شک واشتباہ سے پاک ہوتا ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے اکلوتے دودھ پیتے بچے اسماعیلؑ کو عرب کے سنسان جنگل میں چھوڑ آؤ۔

یہ حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش تھی۔ ابراہیم علیہ السلام خدا تعالیٰ کی مصلحتوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں اور جہاں آج کعبہ ہے وہاں ایک بڑے درخت کے نیچے دونوں ماں بیٹوں کو چھوڑ آتے ہیں اور ان کے ساتھ کیا سامان کرتے ہیں صرف پانی کا ایک مشکیزہ اور کھجوروں کا ایک گٹھا ۔۔۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

ایک مشکیزہ پانی اور کچھ کھجوریں کب تک چلتیں۔ جب وہ سامان ختم ہوگیا تو ہاجرہ سخت پریشان ہوئیں، بھوک اور پیاس بڑھنے لگی اور دودھ خشک ہوگیا۔ ماں کو اپنا اتنا غم نہ تھا جتنا اس معصوم شیر خوار بچے کا۔ بچہ کی حالت خراب ہونے لگی، ہاجرہ بچے سے دور جاکر بیٹھ گئیں تاکہ وہ اپنے معصوم بچے کی حالت زارا پنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکیں۔ لیکن ماں کو چین نہ پڑا بے قرار تھیں اٹھ کر قریب کی پہاڑی (صفا) پر چڑھ گئیں کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ نظر آجائے لیکن وہاں کون نظر آتا۔ بے قراری بڑھی اور اس پہاڑی سے اتر کر دوسری پہاڑی (مروہ) پر چڑھ گئیں وہاں بھی کوئی نظر نہ پڑا۔ وہاں سے دوڑ کر بچے کے پاس وادی میں آگئیں جو بچہ بھوک پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ ہاجرہ اس منظر کو دیکھ کر سات مرتبہ پہاڑیوں پر چڑھیں اتریں اور بچے کے پاس آئیں۔ آخر میں جب مروہ پر تھیں تو ایک آواز سنائی دی۔ ہاجرہ بولیں اے خدا کے بندے اگر تو اس مصیبت میں میری کچھ مدد کر سکتا ہے تو سامنے آ۔ دیکھا تو خدا کا پاک فرشتہ (جبریلؑ) ہے۔ فرشتہ نے اس جگہ جہاں اسماعیل پڑے ایڑیاں رگڑ رہے تھے اپنا پیر مارا جس سے وہاں میٹھے پانی کا ایک چشمہ ابلنے لگا۔ ہاجرہ نے اس میں پانی پیا اور اپنے بچے کو پلایا۔ فرشتہ نے ہاجرہ کو تسلی دیکر کہا۔ ہاجرہ غم نہ کر خدا تعالیٰ تجھے اور تیرے بچے کو ہلاک نہ ہونے دے گا۔ یہ مقام بیت اللہ ہے جس کی تعمیر اس بچے اور اس کے باپ ابراہیمؑ کے مقدس ہاتھوں سے ہونی ہے۔

پھر خدا تعالیٰ نے اس صحرائے لق و دق کی طرف انسانوں کے دل پھیرے اور وہاں قبیلہ بنی جرہم آباد ہوگیا اور ہاجرہ اور اسماعیلؑ کے لئے

جنگل کا ویرانہ انسانوں کی بستی میں تبدیل ہو گیا۔

مکہ بن کھیتی کی زمین ہے، جہاں شور پانی کے سوا آب شیریں کا کہیں نام و نشان نہیں۔ پھر یہ کس کی برکت سے وہاں چشمہ جاری ہوا؟ قدرت کو کس کی حفاظت اور پرورش مقصود تھی، انسانوں کے دل اس طرف کس لئے، یہ کس کے لئے انس و رفاقت کا سامان کیا جا رہا تھا؟

یہ صرف اسماعیل تھے جن کی حفاظت و پرورش مقصود تھی اور آگے چل کر جن سے بنی نوع انسان کی خدمت کے بڑے بڑے کام لینے تھے۔

سچ ہے کہ رسولوں کی زندگی شروع ہی سے بڑے بڑے غیر معمولی واقعات پر مشتمل ہوتی ہے۔

حضرت اسماعیل کی قربانی

حضرت اسماعیل سن شعور کو پہنچے ہی تھے کہ ان کی ذات میں نبوت کا (جو آئندہ ملنے والی تھی) ایک عظیم الشان نشان ظاہر ہوا۔

باپ نے خواب میں دیکھا کہ خدا تعالیٰ اسماعیلؑ کو قربان کرنے کا حکم دے رہا ہے۔ باپ کی تو کڑی آزمائش تھی ہی لیکن اسماعیل کے لئے اتنی سخت آزمائش کا پہلا موقع تھا۔ باپ نے بیٹے سے اپنے خواب کا ذکر کیا۔ بیٹے نے بلا جھجک اور بلا تامل جواب دیا۔ "اے باپ! تمہیں جس بات کا حکم دیا گیا ہے تم فوراً اس کی تعمیل کرو، تم انشاء اللہ مجھے صابر پاؤ گے۔

باپ بیٹے دونوں راضی برضائے الٰہی ہو کر تعمیل حکم کے لئے چلے۔ باپ

نے ممتا کو قربان کیا اور بیٹے نے اپنی جان عزیز پیش کر دی۔ دونوں جنگل میں پہنچے، باپ نے بیٹے کے ہاتھ پیر باندھے، چھری کو تیز کیا اور اسماعیل کو پیشانی کے بل گرا کر گلے پر چھری رکھ دی۔ دونوں آزمائش میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ندا آئی "ابراہیم تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، اسماعیل کو چھوڑ دے اور اس کی جگہ اس مینڈھے کو ذبح کر دے جو تیرے پاس کھڑا ہے۔"

باپ کے صبر و استقلال پر تو اتنی حیرت نہیں کیونکہ ابراہیم بڑے بڑے امتحانوں سے گذر چکے تھے۔ البتہ اسماعیلؑ کے صبر و رضا پر تعجب ضرور ہے۔ لیکن تعجب کی کیا بات ہے، یہ وہ بچہ ہے جسے وحی الٰہی نے پیدائش سے پہلے ہی حلیم و بردبار کہا تھا۔ باپ نے دعا کی تھی، خداوندا! مجھے ایک نیکو کار بچہ عطا فرما! جواب ملا تھا:

"ابراہیم تجھے ایک حلیم بچے کی بشارت ہو۔"

اس صبر و رضا کو دیکھ کر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ جواب اور تسلیم و رضا کا مظاہرہ جو اسماعیل نے کیا اس فطری عزم و حوصلہ کا نتیجہ ہی ہو سکتا ہے جو خدا کی طرف سے ایک ہونے والے پیغمبر کو عطا کیا جاتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام

یوسف علیہ السلام بچپن میں خواب دیکھتے ہیں کہ گیارہ ستارے اور چاند سورج میرے سامنے سربسجود ہیں۔ باپ (یعقوب علیہ السلام) صاحب المرتبت پیغمبر ہیں۔ بیٹے نے خواب سنایا، باپ نے یوسف کو تعبیر کے طور پر علوم و

معارف کی بشارت دی۔

باپ کو بیٹے کے ساتھ والہانہ عشق و محبت تھی دوسرے بھائیوں کو حسد ہوا یوسف کو کھیل کود کے بہانے سے جنگل میں لے جا کر ایک اندھے کنوئیں میں ڈالدیا۔ اور باپ سے آکر کہدیا کہ یوسف کو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا۔

یوسف کنوئیں میں تھے کہ ایک قافلہ اس طرف سے گذرا۔ پانی کے لئے اس قافلہ والوں نے اس کنوئیں میں ڈول ڈالا۔ یوسف ڈول پکڑ کر لٹک گئے اور باہر نکل آئے۔ قافلہ والوں نے یوسف کو غلام بنالیا اور دیگر مال تجارت کے ساتھ انہیں بھی مصر لے گئے۔

ایک بچہ جس کی ماں کا انتقال ہو چکا ہو وہ اپنے باپ کا چہیتا ہو، بھائیوں کے حسد کا شکار ہو کر باپ سے جدا ہوا وطن سے نکلا، آزادی کی جگہ غلامی نصیب ہوئی۔ یوسف حضرت ابراہیمؑ کے گھرانے کے چشم و چراغ تھے، جس گھرانے کا ہر طرف شہرہ تھا۔ اگر یوسف اپنی مصیبت کا اظہار کرتے، شور و غل مچاتے تو قافلہ والوں سے نجات پا کر اپنے گھر آ سکتے تھے لیکن یوسف خاموش ہیں، قسمت پر شاکر ہیں، مصائب پر صابر ہیں اور خدا کے فیصلہ پر راضی برضا، سر تسلیم خم کئے مصر کے بازار میں فروخت ہونے چلے جا رہے ہیں۔

غور کیجئے کیا یہ صبر و رضا ایک (اٹھارہ سالہ) نوعمر جوان کے لئے آسان ہے، یا وہی انسان اختیار کر سکتا ہے جسے قدرت کے مخفی اشاروں نے مطلع کر دیا ہو کہ یوسف! تجھے اس وقت کے سب سے متمدن ملک "مصر" کی اصلاح پر مامور کیا جائے گا اور اس کی سیاسی زمام کار تیرے ہاتھ

میں دی جائے گی۔ اس مقصد عظیم کے لئے جس واقفیت، بصیرت اور انتظامی معاملات کے تجربے کی ضرورت ہے وہ کنعان کی بدوی زندگی میں حاصل نہیں ہو سکتا اس لئے قدرت ایک منظم اسکیم کے ماتحت تجھے مصر کے ایک شاہی خاندان میں پہنچانا چاہتی ہے تاکہ اس ماحول میں تیری صلاحیتیں نشو و نما پا سکیں اور پھر جب تجھے مصر کی حکومت چلانے پر مامور کیا جائے تو تو پیغمبرانہ دیانت اور غیر معمولی سیاسی قابلیت کے ساتھ سلطنت کا نظم و نسق چلا سکے۔

یوسف مصر کے بازار میں فروخت کرنے کے لئے لائے گئے۔ مصر کے ایک رئیس نے جو حکومت کا اعلیٰ عہدہ دار تھا یوسف کو خرید لیا۔ یوسف ایک غلام کی حیثیت سے مصر کے ایک ذی اقتدار خاندان میں پہنچے۔ یوں تو عام طور پر مصری لوگ غلاموں کے ساتھ نہایت حقارت آمیز سلوک کرتے تھے اور پھر یہ تو ایک اونچا خاندان تھا اور یوسف کنعان کے بدوی قبیلے کے ایک فرد تھے، اس لئے یوسف کی جتنی تحقیر ہوتی کم تھی۔ لیکن چند دن ہی گذرے تھے کہ آقا نے اپنی بیوی کو نصیحت کی :

"اس غلام کو عزت و احترام کے ساتھ رکھنا کچھ عجب نہیں کہ یہ
ہمارے لئے مفید ثابت ہو یا اسے ہم اپنا بیٹا بنا لیں۔"

متکبر قوم کے متکبر سردار نے یوسف میں کیا چیز دیکھی جس سے متاثر ہو کر وہ اپنی بیوی کو ایک غلام کے اعزاز و اکرام کا حکم دے رہا ہے ؟

تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یوسف نوعمری ہی میں حلم و وقار، پاک نفسی، امانت اور سلیقہ مندی کے اوصاف کا ایسا اچھا نمونہ تھے کہ ایک مصری سردار

ان کی شاندار شخصیت کو خراج تحسین ادا کئے بغیر نہ رہ سکا، اور یہ سب خدائی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا ورنہ یوسف ایک بدوی تھے نہ انہوں نے کسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی اور نہ کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب طے کئے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

ایک ایسے دور میں جس میں مصر کے جابر شہنشاہ نے یہ ظالمانہ آرڈر جاری کر رکھا تھا کہ خاندان اسرائیل کا کوئی لڑکا زندہ نہ بچنے پائے، عمران کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا۔

اس اسرائیلی بچے کو تین مہینے تک کسی نہ کسی طرح سرکاری جاسوسوں کی نگاہ سے محفوظ رکھا گیا۔ تین مہینے کے بعد عمران کی بیوی کو سخت تشویش لاحق ہوئی کہ اب اس بچے کو کس طرح بچایا جائے؟

عمران کی بیوی اس پریشانی میں تھیں کہ ان کے دل میں القاء ہوا القاء کرنے والا خود بیان کرتا ہے:

"ہم نے اسے سمجھایا کہ بچے کو ایک صندوق میں ڈالدے اور پھر اس صندوق کو دریا (نیل) میں چھوڑ دے، دریا اسے کنارے پر ڈال دے گا۔ پھر اسے وہ اٹھائے گا جو میرا بھی دشمن ہے اور اس بچے کا بھی۔" (سورۂ طٰہٰ)

"اس کے بعد اے عمران کی بیوی! تو بے غم رہیو ہم اس بچے کو تیری ہی آغوش میں واپس کرا دیں گے اور اسے رسولوں میں کریں گے۔" (قصص)

اس بچے میں کیا خصوصیت تھی جس کی بنا پر اس کی ماں خدائی الہام کی مخاطب ہو رہی ہے اور اسے بچے کی حفاظت کے لئے خاص تدبیر اختیار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے، اس عظیم خوشخبری کے ساتھ کہ یہ واپس ہو گا اور رسول بنے گا۔

عمران کی بیوی نے الہامِ الٰہی کی تعمیل کی۔ بچے کو الٰہی حکم کے مطابق دریا میں ڈالدیا۔ خدائی پیغام تسلی کے لئے کافی تھا مگر مزید اطمینان کے لئے اپنی لڑکی سے کہا کہ تو صندوق کے پیچھے پیچھے جا کر دیکھ کہ خدا تعالیٰ اپنا وعدہ کس طرح پورا کرتا ہے۔

عمران کی لڑکی نے دیکھا کہ بھائی کا صندوق تیرتا ہوا شاہی محل کے کنارے آلگا اور شاہی گھرانے کی ایک عورت نے اسے دیکھ کر اٹھا لیا۔

صندوق شاہی محل میں پہونچا۔ فرعون کی بیوی نے جو اس پر نگاہ ڈالی تو ایک ہی نگاہ میں ہزار جان سے عاشق ہو گئی اور کہنے لگی:

"اس بچے کو قتل نہ کرو، ممکن ہے کہ یہ ہمارے کام آئے، یا ہم اسے اپنا بیٹا بنا لیں"۔ (قصص)

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ بچے کو دودھ کون پلائے، شاہی دایہ بلائی گئیں مگر بچے نے کسی دایہ کے دودھ کو منہ میں نہ لگایا۔ بچے کی بہن کھڑی سب تماشہ دیکھ رہی تھی۔ شاہی محل والوں کی پریشانی اور حیرانی دیکھ کر بولی، کیا میں ایک ایسی دایہ کا پتہ نہ بتاؤں جو نہایت نیک اور محنتی ہے۔ فرعون کی بیوی نے فوراً اسے لانے کا حکم دیا۔

بہن گھر آئی اور بے قرار ماں کو ساری داستان سنا کر اپنے ساتھ لے گئی خدا کا وعدہ پورا ہوا عمران کی بیوی کی گود پھر بھر گئی اور ان کی آنکھیں اپنے نورِ چشم سے دوبارہ ٹھنڈی ہو گئیں۔

یہ بھی الٰہی مصلحت و تدبیر کہ ماں کی مامتا بھی ٹھنڈی رہی اور یہ اسرائیلی بچہ شاہی تربیت میں پرورش پانے کے لئے ان لوگوں کی آغوش میں بھی آگیا جو اسرائیلی بچوں کے جانی دشمن تھے اور خود اس بچے کے بھی خون کے پیاسے۔

ایک بچے کی دشمنوں کے ہاتھوں پرورش، اور اس کا یہ حیرت انگیز طریقہ، کیا اس بات کا پتہ نہیں دے رہا تھا کہ (۱) یہ اسرائیلی بچہ دوسرے اسرائیلی بچوں سے ایک ممتاز حیثیت کا مالک ہو گا (۲) مستقبل قریب میں یہ تاریخ کی ایک عظیم الشان شخصیت بنے گا (۳) اس کے ساتھ غیب کی مخفی طاقتیں ہیں جو آئندہ اس سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہیں ——— یہی نبوت کے آثار و علامات ہیں۔

یہ اسرائیلی بچہ جب شاہی تربیت میں پل بڑھ کر جوان ہو گیا تو اب اس نے مصر کے حالات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ جس باپ کی گود میں پروان چڑھا ہے وہ بدترین ظالم ہے اور بندگانِ الٰہی اس کے مظالم کے بوجھ میں دبے پڑے بلک رہے ہیں۔ اس سے ان حالات پر صبر نہ ہو سکا اور اس نے مظلوموں کی مدد شروع کر دی، فرعون اسے برداشت نہ کر سکا اور بالآخر اس اسرائیلی جوان کو وطن چھوڑنا پڑا۔

یہ اسرائیلی جوان مصر کو خیرباد کہہ کر مدائن پہونچا۔ یہ بستی مصر سے

آٹھ منزل پر واقع تھی اور اس کے رہنے والے اس جوان کے قریبی رشتہ دار تھے، جب یہ بستی میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ بستی کے کنوئیں پر لوگ اپنے اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے ہیں اور دو لڑکیاں اپنے مویشیوں کو لئے دور کھڑی ہیں۔ اس نے ان لڑکیوں کو الگ تھلگ کھڑے ہوئے دیکھ کر پوچھا، تم پیچھے کیوں کھڑی ہو، اپنے مویشیوں کو پانی کیوں نہیں پلاتیں؟ وہ بولیں، ہم کمزور ہیں، جب آگے بڑھتے ہیں تو یہ زور آور لوگ ہمیں پیچھے دھکیل دیتے ہیں، باپ ہمارے بوڑھے ہیں، جب یہ سب چلے جائیں گے تو بچا کھچا پانی ہم بھی اپنے مویشیوں کو پلالیں گے۔

زور اور طاقت کے گھمنڈ کا جو تماشا اس مصری جوان نے مصر کی سرزمین پر دیکھا تھا وہی یہاں بھی سامنے آگیا۔ بس کمزور کی اس مظلومیت کو دیکھ کر اسرائیلی جوان کو جوش آگیا اور وہ بھیڑ کو چیر کر آگے بڑھا۔ کنوئیں پر پہنچا، ڈول ڈالا اور تنہا پانی کھینچ کر ان لڑکیوں کے مویشیوں کو پلایا۔ طاقت وروں کو اس مسافر کی جرأت پر غصہ آیا۔ لیکن اس کی ہمت مردانہ سے کچھ ایسے مرعوب ہوئے کہ منہ سے کچھ نہ بول سکے اور حیران کھڑے اس کا منہ تکتے رہے۔

لڑکیاں جب خلاف معمول سویرے سے اپنے گھر واپس لوٹیں تو بوڑھے باپ نے تعجب سے اس کی وجہ پوچھی۔ لڑکیوں نے اس "مصری مسافر" کی جرأت کا سارا ماجرا سنایا اور بتایا کہ اس جوان نے کس طرح ہماری بے کسی پر رحم کھا کر ہماری مدد کی۔ بوڑھے باپ (حضرت شعیب علیہ السلام) کی پیغمبرانہ فراست نے تاڑ لیا کہ طاقت وروں کے جبر و زبردستی کے مقابلہ میں کمزوروں

کی بے بسی پر بے قرار ہو کر جان جوکھوں میں ڈالنے والا ایسے ماحول میں جہاں حق و انصاف کی آواز سننے والا بھی کوئی نہ ہو، کوئی زبردست صاحب عزیمت انسان ہی ہو سکتا ہے۔ بیٹی سے کہا فوراً جاؤ اور اس مسافر کو میرے پاس بلا کر لاؤ۔ لڑکی آئی اور کہا آپ کو ہمارے والد بلاتے ہیں تاکہ اس احسان کا بدلہ دیں۔

اسرائیلی جوان نے "اس جوان لڑکی" سے کہا، میں تیرے ساتھ چلتا ہوں مگر تو میرے آگے آگے نہ چل بلکہ پیچھے پیچھے آ اور کنکریاں پھینک کر مجھے راستہ بتاتی جا۔

مصری مسافر شیخ مدین کے پاس پہنچے، بات چیت ہوئی۔ گفتگو کے بعد بیٹی نے باپ سے کہا:

"ابا جان اس مسافر کو مویشی چرانے کے لئے ملازم رکھ لیجئے، ملازم وہی بہتر ہوتا ہے جو طاقت ور اور امانت دار ہو"۔

باپ نے بیٹی کی اس سفارش پر تعجب کیا اور پوچھا تجھے کیسے معلوم ہوا کہ یہ مسافر طاقت ور اور امانت دار ہے؟ بیٹی نے کہا، اس سے زیادہ اور طاقت کیا ہو گی کہ سب زور آوروں کو دھکیل کر اس نے ہمارے جانوروں کو پانی پلا دیا اور اس سے زیادہ امانت کیا ہو گی کہ اس نے مجھے دیکھ کر اپنی نظریں نیچی کر لیں اور مجھ سے کہا کہ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔

باپ بیٹی کے جواب سے بہت مسرور ہوئے اور اس مصری مسافر کو بکریاں چرانے کے لئے اپنے پاس رکھ لیا۔

مظلوموں کی مدد کا یہ جذبہ کہ وطن سے بے وطن ہونے پر بھی وہ کم نہ ہوا بلکہ اور بڑھا۔ جوانی میں نگاہ کی پاکبازی اور شرم وحیا کا یہ عالم کہ ایک جوان لڑکی کا آگے آگے چلنا بھی گوارا نہ کیا، کس مستقبل کا پتہ دے رہا تھا؟ کیا یہ جرأت اور یہ کیرکٹر اس بات کا نشان نہ تھا کہ اسے کسی اہم خدمت کے لئے چن لیا ہے اور اس اندھیرے ماحول میں اس کی روشن فطرت اور خشیت الٰہی سے لبریز دل دنیا کی اصلاح وہدایت کا سرچشمہ بننے والا ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام

انبیاء سابقین میں حضرت صالح علیہ السلام کے متعلق بھی ان کی قوم کے الفاظ قرآن نے نقل کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نوعمری ہی میں حضرت صالح ؑ کے کیرکٹر اور ان کی ذہنی اور فکری صلاحیت نے قوم کی نگاہیں ان پر مرکوز کر دی تھیں، ان کی پیشانی سے رشد وہدایت کے جو آثار ہویدا تھے انہیں دیکھ کر ان کی قوم یہ سمجھ گئی کہ یہ شخص ساری قوم میں ممتاز شخصیت کا مالک ہوگا۔ وہ حضرت صالح کے تدبر اور معاملہ فہمی سے متوقع تھے کہ یہ ہونہار نوجوان اپنی قوم کو چار چاند لگائے گا۔ لیکن ان تمام خوبیوں میں انہیں ایک بات بالکل ناپسند تھی اور وہ یہ کہ یہ نوجوان اپنے قومی مذہب سے بیزار تھا۔ وہ بت پرستی اور جاہلانہ مراسم سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ اس بات کی وہ شکایت بھی کرتے تھے۔ چنانچہ جب منصب نبوت پر فائز ہوکر حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کے عقائد اور عبادات پر سخت تنقید فرمائی تو قوم چلا اٹھی اور کہا:

قالوا يٰصلح قد کنت فینا مرجواً قبل ھذا اتنھنا ان نعبد ما یعبد اٰباءنا وانّنا لفی شکّ ممّا تدعونا الیہ مریب۔
(سورۂ ہود، رکوع ۶)

"بولے اے صالح! تجھ سے تو ہم کو امید تھی اس سے پہلے کیا تو ہم کو منع کرتا ہے کہ بندگی کریں جن کی بندگی کرتے رہے ہمارے باپ دادا، اور ہم کو تو شبہ ہے اس میں جس کی طرف تو بلاتا ہے ایسا کہ دل نہیں مانتا۔"

حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ فرماتے ہیں:
"یعنی ہونہار لگتا تھا کہ باپ دادے کی راہ روشن کرے گا تو لگا مٹانے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ چوں کہ ایک بدترین قوم (یہود) سے ہونے والا تھا، اس لئے خدا تعالےٰ نے ان کی زندگی کو یوم اول ہی سے بالکل نمایاں اور ممتاز بنایا تھا تاکہ شروع سے یہود پر اتمام حجت ہوتا رہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صداقت سے انکار کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش کا جب وقت قریب آیا تو ان کی والدہ حضرت مریم گھبرائیں اور باوجود اس کے کہ خدا تعالےٰ نے فرشتے کے ذریعہ ان کو ہر طرح کا اطمینان دلایا تھا پھر بھی بن شوہر کے بچہ جننے کا خیال انہیں بے قرار کرتا رہا، یہاں تک کہ وہ بستی سے باہر ایک مقام پر چلی گئیں۔

حضرت مریم جہاں گئیں وہ جگہ بیت المقدس سے آٹھ میل پر واقع ہے اور یہ وہی جگہ ہے جسے آج "بیت اللحم" کہتے ہیں۔

وضع حمل کا وقت قریب آیا، درد زہ کی تکلیف، تنہائی و بے کسی، ضرورت وراحت کے سامان کا فقدان، پھر قوم میں بدنامی کا اندیشہ، یہ سب باتیں بشریت کا تقاضا تھیں۔ فرشتہ نے آکر تسلی دی، اسی جگہ پانی کا ایک چشمہ جاری ہو گیا، کھجور پر تر و تازہ پھل موجود تھے ہی، خدا تعالیٰ نے ضرورت کا سارا سامان مہیا فرما دیا، حضرت مریم کی آنکھیں ایک چاند سے بچہ سے ٹھنڈی ہو گئیں۔

اب سارے مرحلے گذر چکے تھے صرف ایک مرحلہ باقی تھا کہ بستی میں جانا ہے جنگل میں کب تک پڑی رہوں گی، اس بچہ کو دیکھ کر قوم کیا کہے گی۔ اسی پریشانی میں تھیں کہ خدا تعالیٰ کا حکم پہنچا کہ گھبراؤ نہیں بے کھٹکے بچے کو لے کر گھر جاؤ، البتہ ایسا کرو کہ نہ بولنے کی نیت کر لو (بنی اسرائیل کی شریعت میں بولنے کا بھی روزہ ہوتا تھا) پھر جب کوئی تم سے آکر پوچھے تو اشارہ سے بتا دینا کہ میں جواب دینے سے قاصر ہوں میرا روزہ ہے۔

اس ہدایت کے بعد مریم بستی میں آئیں۔ لوگوں کو صبر کہاں ہو سکتا تھا کنواری مریم کی گود میں بچہ دیکھ کر چلا اٹھے۔ مریم! یہ بچہ کہاں سے آیا؟ حضرت مریم نے ہدایت الٰہی کے مطابق اشارہ کر دیا کہ حقیقت حال اس بچے سے براہ راست پوچھو۔ قوم کے لوگ اسے دوسری ستم ظریفی سمجھ کر "ایک بچہ ہمارے سوال کا جواب کیسے دے سکتا ہے" ادھر یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ

حق تعالیٰ نے ادھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گویا کر دیا، یہ بولے:

قال انی عبد اللہ اتانی الکتاب وجعلنی نبیاً و جعلنی مبارکاً این ماکنت واوصانی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ مادمت حیاً وبراً بوالدتی ولم یجعلنی جباراً شقیا والسلام علیّ یوم ولدت ویوم اموت ویوم ابعث حیاً ط

(سورۂ مریم ۲۶)

"وہ بولا، میں بندہ ہوں اللہ کا مجھ کو اس نے کتاب دی ہے اور مجھ کو اس نے نبی کیا اور بنایا مجھ کو برکت والا جس جگہ میں ہوں اور تاکید کی مجھ کو نماز کی اور زکوٰۃ کی جب تک میں رہوں زندہ، اور سلوک کرنے والا اپنی ماں سے اور نہیں بنایا مجھ کو زبردست بدبخت، اور سلام ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں اور جس دن اٹھ کھڑا ہوں زندہ ہو کر۔"

ایک بچے کی معجزانہ گفتگو نے معاملہ کی ساری حقیقت کھول کر بیان کر دی۔ بن باپ کی پیدائش پر نادان لوگ ایک پاک دامن عورت پر جو ناپاک تہمت لگا رہے تھے، اس کا جواب دیدیا۔ اول تو اتنے سے بچہ کا کلام کرنا اور پھر کلام بھی نہایت فصیح اور معقول .... یہ اس امر کی دلیل تھی کہ اس بچہ کی پیدائش بھی توالد و تناسل کے عام طریقے سے مستثنیٰ ہے اور خدا کی غالب قدرت کا ایک نشان ہے۔

نیز اسی گفتگو سے اس بچہ کا مستقبل اور اس کے آئندہ مشن کا پتہ چل رہا تھا۔ نہ ہر بچہ ماں کی گود میں ایسی گفتگو کر سکتا ہے اور نہ ہر عورت

بن شوہر کے اس طرح بچہ جن سکتی ہے۔
یہ ایک ہونے والے نبی کی خصوصیت تھی جس کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا تھا کہ لوگ سمجھ لیں کہ معاذ اللہ یہ بچہ نہ تو مجہول النسب ہے نہ کذاب و مفتری ہے اور نہ یہ خدا کا بیٹا یا خدا ہے۔
یہ چند مشہور پیغمبروں کے بچپن اور جوانی کے حالات ہیں۔ اب چند باتیں نبی آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی سنئے کہ نبوت ملنے سے پہلے آپ کی زندگی کتنا حیرت انگیز امتیاز رکھتی تھی۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم

اگلے پیغمبروں کے بعد اب خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے کی زندگی پر غور کیجئے۔ جس زندگی کو حضورؐ نے اپنے مخالفین کے سامنے اپنے دعویٰ نبوت کے ثبوت میں پیش فرمایا اور اسے اپنی صداقت کی دلیل بنا کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔

قل لوشاء اللہ ما تلوتہ علیکم ولا ادراکم بہ فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ افلا تعقلون فمن اظلم ممن افتریٰ علی اللہ کذبا او کذب بآیاتہ

"تو کہہ کہ اگر اللہ چاہتا تو میں نہ پڑھتا یہ تمہارے پاس اور نہ وہ تم کو خبر کرتا اس کی کیونکہ میں رہ چکا ہوں تم میں ایک عمر اس سے پہلے کیا پھر تم نہیں بوجھتے پھر کون ظالم زیادہ اس سے جو بنا دے اللہ پر جھوٹ یا جھٹلا دے

إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُونَ۔ اس کی آیتیں، بے شک بھلا نہیں ہوتا

(سورۂ یونس ۲) گناہ گاروں کا"

مطلب یہ کہ میری زندگی کے چالیسؔ برس تم میں گذرے، بچپن ہو یا جوانی سب تمہارے سامنے ہیں۔ میری جلوت تو ہے ہی جلوت، میری خلوت بھی جلوت کی طرح آشکارا ہے۔ پھر بتاؤ کیا میں نے آجتک کسی بڑے چھوٹے کی طرف سے کوئی غلط بات کہی ہے، غلط بیانی کی ہے، جھوٹ بولا ہے۔ اگر نہیں اور تم چالیس سالہ زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کر سکتے، تو پھر بھلا میں خدا تعالیٰ کا نام لیکر اپنی بات کیسے کہہ سکتا ہوں، میں اتنی جسارت کیسے کرسکتا ہوں کہ اپنے خیالات کو خدا کا کلام بتا کر تمہیں بہکادوں۔

دوسری بات یہ کہ تم نے چالیس سالہ زندگی میں کبھی ایک دن میری زبان سے شعر و شاعری سنی، کسی ادیب یا شاعر کے سامنے کچھ سیکھتے دیکھا، میرے ہاتھ میں کبھی قلم دوات تمہیں دکھائی دی، کسی مدرسہ میں آتے جاتے تمہیں نظر پڑا۔ اگر نہیں تو پھر مجھ جیسا امی ایسا کلام کیسے تصنیف کرسکتا ہے، ایسا مکمل اور عالمگیر قانون حیات کیونکر وضع کرسکتا ہے، کیا آجتک کبھی ایسا ہوا ہے کہ ایک اَن پڑھ انسان زندگی کے چالیسؔ سال گذار چکنے کے بعد اچانک ہدایت کی ایسی باتیں بتانے لگا ہو جن کے مقابلہ میں سارے رسمی علوم و معارف ماند پڑ گئے ہوں۔

پھر یہ کہ چلو ان سب باتوں کو تسلیم کرلو کہ ایک شخص انتہائی غلط بیانی اور افترا پردازی سے کام لیکر خدا تعالیٰ پر جھوٹ باندھے اور پھر اس کی زندگی

اس قدر کامیاب ہو؟ وہ اس قدر آزادی اور جرائت کے ساتھ دشمنوں میں پھرتا رہے، اس کی زبان میں اس قدر تاثیر ہو، اس کی شخصیت میں اس قدر محبوبیت ہو کہ لوگ ہزار قسم کی تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑیں اس کو اس کے کٹر دشمن جادوگر یا پاگل تو کہدیں لیکن جھوٹا یا بد دیانت کہنے کی جرائت نہ کر سکیں۔

ایسی کامیاب زندگی کیا ایک گناہ گار اور مجرم کی ہو سکتی ہے؟ حاصل یہ کہ نہ میں نے آجتک جھوٹ بولا اور نہ کوئی شخص اتنی جرائت کے ساتھ خدا پر جھوٹ باندھ سکتا ہے، میں تو جو کچھ کہہ رہا ہوں خدا کی طرف سے کہہ رہا ہوں، جو خدا کی طرف سے آرہا ہے وہ پہنچا رہا ہوں۔

یہی وہ بہترین استدلال تھا جو ہرقل اعظم نے اختیار کیا۔ ابوسفیان سے پوچھا:

فھل کنتم تتھمو بالکذب قبل ان یقول ما قال قلت۔ لا۔	"کیا تم نے کبھی اس شخص پر دعوئ نبوت سے پہلے جھوٹ کا الزام لگایا ہے؟ میں نے کہا، نہیں۔"

ہرقل نے اس سے استدلال کیا، اور کہا:

"پس جس شخص نے آجتک کسی انسان کی طرف سے جھوٹی بات نہیں کہی، وہ خدا کی طرف سے غلط بات کیسے کہہ سکتاہے۔"

ہرقل نے پھر ایک سوال یہ کیا:

قال ایزیدون ام ینقصون	"اس کے پیرو زیادہ ہو رہے ہیں یا کم؟

وقلت بل یزیدون۔ میں نے کہا، زیادہ ہو رہے ہیں۔"

اس پر ہرقل نے کہا:

"رسولوں کے پیرو زیادہ ہی ہوتے ہیں۔"

اس سوال سے ہرقل کا مطلب بھی وہی تھا جو قرآن کریم کے "لا یفلح المجرمون" کا ہے۔ یعنی جھوٹا اور فریبی انسان کبھی اس طرح دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی نہیں کر سکتا، وہ تو چند روز ہی میں بدنام ہو جاتا ہے، الاّ یہ کہ دولت و اقتدار اور حکومت کے سہارے وہ جھوٹا انسان اپنے مکر و فریب کو لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اور ان کی زبانیں بند کر کے چند روز اور چلا لے۔ لیکن جوں ہی اقتدار کا سہارا ختم ہوتا ہے مکر و فریب کا سارا تار پود بکھر جاتا ہے۔

آیئے اب حضورؐ کی اس چالیس سالہ زندگی پر ایک اجمالی نظر ڈالیں۔

شرک سے اجتناب

عرب ایک مدت سے بت پرستی میں مبتلا تھا، وہ بابرکت تاریخی عبادت گاہ جسے توحید الٰہی کے مبلغ اعظم ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا، تین سو ساٹھ بتوں کی نجاست سے ملوث تھی۔

یہی چھوٹے بڑے بت تھے جن سے وہ زندگی کی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی ضرورت طلب کرتے تھے اور ان کے آگے سر جھکاتے تھے خدا کا تصور ان میں موجود تھا لیکن وہ خدا کو عضو معطل سے زیادہ حیثیت نہ دیتے

تھے، ان کا سارا کاروبار دینی اور دنیوی، سب بتوں سے چل رہا تھا۔ حد ہے کہ اگر ان کے سامنے خدائے واحد کا نام لیا جاتا تھا تو عرب کے بت پرستوں کو بہت ناگوار ہوتا تھا۔

واذا ذکر اللہ وحدہ اشمأزت قلوب الذین لا یؤمنون بالاخرۃ واذا ذکر الذین من دونہ اذا ھم یستبشرون۔	"اور جب نام لیجئے خالص اللہ کا رک جاتے ہیں دل ان کے جو یقین نہیں رکھتے پچھلے گھر کا اور جب نام لیجئے اس کے سوا اوروں کا تب وہ لگیں خوشیاں کرنے۔"
(سورۂ زمر ۵)	

حالانکہ بحیثیت خالق ارض وسماء کے وہ خدائے واحد ہی پر ایمان رکھتے تھے:

ولئن سألتھم من خلق السمٰوٰت والارض وسخر الشمس والقمر لیقولن اللہ فانّٰی یؤفکون۔	"اور اگر تو لوگوں سے پوچھے کہ کس نے بنایا ہے آسمان و زمین کو اور کام میں لگایا چاند اور سورج کو، تو کہیں اللہ نے۔ پھر کہاں سے الٹے جاتے ہیں۔"
(سورہ عنکبوت ۶)	

لیکن یہ ایمان ویقین اس عقیدۂ باطل میں گم ہو چکا تھا:

مانعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ۔	"ہم ان بتوں کی پوجا کرتے ہیں، اس واسطے کہ ہم کو پہنچا دیں اللہ کی طرف قریب کے درجہ میں۔"
(سورۂ زمر ۱)	

اس بت پرستانہ ماحول میں خاندان ہاشم میں ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے، بت پرستوں کی گود میں آنکھیں کھولتا ہے۔ ان ہی میں پل کر بڑا ہوتا ہے، ان ہی سے میل جول رکھتا ہے، لیکن وہ نوجوان بت پرستی سے سخت متنفر ہوتا ہے وہ اپنی قوم کے بے حقیقت معبودوں سے بیحد بیزار ہوتا ہے۔

زید ابن حارث حضورؐ کے خادم خاص فرماتے ہیں:

"عہد جاہلیت میں جب مشرک بیت اللہ کا طواف کرتے تو اساف اور نائلہ (مشہور بت تھے) کو چھوتے تھے۔ ایک دفعہ میں حضورؐ کے ساتھ بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا جب میں ان بتوں کے پاس سے گذرا تو میں نے ان کو چھوا۔ آپؐ نے مجھے منع کیا۔ میں نے دل میں کہا دیکھو تو سہی چھونے سے ہوتا کیا ہے، اس خیال سے میں نے دوبارہ ان بتوں کو چھوا۔ حضورؐ نے اب کی دفعہ سختی سے منع فرمایا کیا میں نے تمہیں منع نہ کیا تھا۔ زید فرماتے ہیں واللہ اس کے بعد میں نے اس بت کو پھر کبھی ہاتھ نہیں لگایا یہاں تک کہ خدا تعالیٰ نے حضورؐ کو نبوت سے سرفراز فرما دیا۔

یہی وہ ہاشمی نوجوان تھا جس کے گھرانوں میں صدیوں سے بت پرستی ہوتی چلی آ رہی تھی۔ اس نے ہوش سنبھالتے ہی باپ دادا کے اس طریقہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔

اس نوجوان کا ایک پڑوسی کہتا ہے، میں نے حضورؐ کو اپنی بیوی حضرت خدیجہ سے یہ گفتگو کرتے سنا۔

"خدا کی قسم میں کبھی لات کی پوجا نہیں کروں گا، خدا کی قسم میں کبھی

عزیٰ کی پوجا بھی نہیں کروں گا"

(خصائص کبریٰ ص ۸۹، ۹۰)

نہ صرف یہ کہ اس نوجوان کی پیشانی غیر اللہ کے آگے جھکنے اور مشرکانہ اعمال سے محفوظ رہتی ہے بلکہ اس کی زبان بھی ان بتوں کی ناپاک قسموں سے آلودہ ہونا نہیں چاہتی۔

حضرت خدیجہ کے تجارتی قافلے کے ساتھ جب آپ تشریف لے گئے، تو اس موقعہ پر ایک خریدار سے کسی چیز کی قیمت پر کچھ اختلاف ہو گیا۔ گاہک نے عرب کے دستور کے مطابق حضورؐ سے کہا:

احلف باللات والعزیٰ "لات وعزیٰ کی قسم کھائیے"۔

اس ہاشمی تاجر نے نہایت حقارت کے ساتھ فرمایا:

"میں ہرگز ان کی قسم نہیں کھاؤں گا"

گاہک نے اس سوداگر کے تیور دیکھے، اس کے باوقار چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ پرے ہٹ کر حضورؐ کے ساتھی حضرت خدیجہ کے غلام میسرہ سے حضورؐ کی بڑی تعریف کی اور حیرت سے کہا، اس ماحول میں یہ نوجوان بالکل انوکھا معلوم ہوتا ہے۔ (ابن سعد جزء اول ص ۸۳)

قومی میلوں میں بڑے چھوٹے سب شریک ہوتے ہیں۔ ان میلے تہواروں کو سماج میں بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

میلے تہوار قوموں کے عقائد وجذبات کا مظہر ہوتے ہیں۔ ایک مشرک قوم کے تہواروں میں شرک وتوہم پرستی کی آئینہ ہوتی ہیں اور ایک توحید

پرست قوم کے میلوں میں توحید اور اس کے اثرات کا رنگ ہوتا ہے۔
عرب کے میلوں میں بھی شرک کا مظاہرہ اور جاہلانہ رسوم کی ادائیگی ہوتی تھی۔

عبداللہ کا یہ یتیم اپنے قومی میلوں سے ہمیشہ دور رہتا تھا، ایک دفعہ حضورؐ کے چچا اور آپ کی پھوپیوں نے اصرار کیا کہ بیٹا ہمارے ساتھ تہوار کی خوشی میں شریک ہو۔ آپ نے ساتھ چلنے سے معذوری ظاہر کی۔ جب بہت اصرار کیا تو آپ گھر سے چلے گئے۔ چند روز کے بعد آئے۔ گھر کی عورتوں نے پوچھا، کہاں تھے؟ فرمایا میری طبیعت پر کچھ اثر تھا۔ عورتیں سمجھیں کہ شاید جن بھوت کے اثر کا خیال ہو گیا ہے۔ بولیں:

ما کان اللہ لیبتلیک بالشیطان وفیک من خصال الخیر۔

(ابن سعد صـ۱۰۲)

"خدا تعالیٰ آپ کو شیطان کے اثر میں مبتلا نہیں کر سکتا کیونکہ آپ میں بڑی اچھی اچھی خصلتیں جمع ہیں۔

بھوت پلید اور جن و شیطان کے متعلق عربوں کے بڑے عجیب و غریب خیالات تھے۔ یہ کسی کو غول، کسی کو عامر، کسی کو شیطان اور کسی کو عفریت کہتے تھے۔ عفریت کے متعلق ان کا خیال تھا کہ یہ بچوں اور جوانوں کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔ عمرو بن عدی لخمی کے بارے میں مشہور تھا کہ اسے عفریت اٹھا کر لے گیا اور کئی برس کے بعد جذیمہ ابرش کو لا کر دے گیا، عمرو ابن عدی عرب کا ایک بادشاہ تھا۔

اسی طرح خرافہ کا واقعہ بھی عرب میں مشہور تھا کہ اسے جن اٹھا کر لے گئے اور مدتوں کے بعد وہ واپس آیا۔ وہ عجیب عجیب باتیں کہتا تھا۔ (شمائل ترمذی باب السمر)

بتوں کے کھانے سے اجتناب

تاریخ بتاتی ہے کہ وحشت وجہالت کے مارے ہوئے عربوں میں حرام، حلال کی بالکل تمیز نہ تھی۔ وہ ہر اس چیز کو کھا جاتے تھے جو انہیں مل جاتی تھی۔ نہ زمین کے کیڑے مکوڑوں کو چھوڑتے تھے نہ مردار جانوروں کو، خون جما کر اس کی قاشیں کاٹ کر کھانے کا بھی عام رواج تھا۔ بتوں کے نذرانوں اور تھانوں پر ذبح کئے ہوئے جانوروں کے کھانے میں تو انہیں تامل ہو ہی کیا سکتا تھا کیونکہ اسے تو وہ اپنے معبودوں کی نیاز سمجھتے تھے۔

اس حرام خور سوسائٹی میں اس ہاشمی لڑکے کی فطرت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ حرام وحلال میں تمیز کرتا ہے، پاک وناپاک کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ نہ اسے کوئی سکھاتا ہے نہ پڑھاتا ہے اور نہ یہ باتیں سکھانے اور پڑھانے والا پوری سوسائٹی میں کوئی موجود ہی ہے۔ لیکن اس کا ذوق سلیم اسے سب کچھ بتاتا رہتا ہے چنانچہ ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ قریش کے کچھ لوگوں نے آپ کے سامنے کھانا لاکر رکھا۔ اس مجلس میں زید بن عمرو ابن نفیل بھی موجود تھے۔ حضورؐ نے اس کھانے میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اور فرمایا "میں بتوں کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور اور بتوں کے چڑھاوے نہیں کھاتا۔ میں تو صرف وہی چیز کھاتا ہوں جس پر خدا کا نام لیا جاتا ہے"۔

زید کہتے ہیں حضورؐ کے انکار کے بعد میں نے بھی کھانے سے انکار کر دیا۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۱۰۵)

بے شرمی اور بے حیائی

جس معاشرہ میں اس نوجوان نے عمر کا بہترین حصہ گذارا اس میں بے حیائی عام تھی۔ زنا اور فسق و فجور کے داغ دھبوں سے کوئی دامن پاک نہ تھا۔

عرب کے مایۂ ناز شاعر اپنی بہنوں سے عشق بازی کرتے اور فخریہ ان بے حیائیوں کو نظم کرتے، پھر ان قصیدوں کے اشعار مزے لے لے کر گائے جاتے۔

بڑے بڑے صاحب ثروت امراء اپنی لونڈیوں سے بدکاری کراتے اور اس قابل نفرت کمائی سے عیش و عشرت کی داد دیتے۔

عبادت کے اندر بھی بے شرمی کا مظاہرہ کرتے جسم ننگے ہو کر بیت اللہ کا طواف کرتے، عورتیں بھی اور مرد بھی، سوائے قریش کے۔

نہ نہانے دھونے میں شرمگاہ کو چھپاتے، نہ پیشاب کے وقت پردے کو ضروری سمجھتے۔

شراب اور جوا سب بے حیائیوں کی جڑ ہیں اور یہی دونوں چیزیں عرب کی محبوب ترین تفریحات تھیں۔ ان تفریحات میں شریک نہ ہونا ان کے نزدیک سخت عار کی بات تھی۔

ایسے بے حیا لوگوں کے درمیان ایک نوجوان ایسا حیادار ہے کہ زندگی میں اس کو کسی نے ننگا نہیں دیکھا۔ بد اخلاق لوگوں میں گھرا ہوا ہو کر بھی وہ ایسا پاکیزہ اخلاق ہے کہ کبھی کسی بدکاری اور بداخلاقی کے قریب

نہیں پایا گیا۔ شراب کا کبھی مزا نہیں چکھا۔ جوے کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اس پاکیزہ نفس نوجوان سے خود سنیئے:

حضورؐ سے پوچھا گیا، آپ نے کبھی کسی بت کو پوجا ہے؟ فرمایا کبھی نہیں۔ پھر پوچھا، آپ نے کبھی شراب پی ہے؟ فرمایا کبھی نہیں۔ میں ان چیزوں کو برا سمجھتا تھا اگرچہ مجھے کتاب و ایمان کا علم ابھی تک عطا نہیں ہوا تھا۔ (خصائص کبریٰ ص ۸۹)

قرآن کریم نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

وکذالک اوحینا الیک روحا من امرنا ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان ولکن جعلناہ نورا نھدی بہ من نشاء من عبادنا۔ (سورۃ شوریٰ ع ۵)

"اور اسی طرح بھیجا ہم نے تیری طرف ایک فرشتہ اپنے حکم سے تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب، اور نہ ایمان و لیکن ہم نے رکھی ہے یہ روشنی اس سے راہ سمجھا دیتے ہیں، جس کو چاہیں اپنے بندوں میں سے۔"

مفسرین نے آیت پر تقریر کرتے ہوئے کہا ہے:

یعنی حضور ایمان اور اعمالِ ایمانیہ کی تفصیلات سے واقف نہ تھے، یہ تفصیلی علم تو آپ کو وحی کے ذریعہ سے بخشا گیا۔ البتہ نزولِ وحی سے پہلے حضور نفسِ ایمان سے ضرور متصف تھے۔

طبیعت اس قدر حیادار واقع ہوئی تھی کہ آپ قضائے حاجت کے لئے آبادی سے بہت دور تشریف لے جایا کرتے تھے، اتنی دور کہ

اس حالت میں کبھی کسی نے آپ کو نہیں دیکھا۔

(ابن سعد باب علامات النبوۃ)

یہ ہاشمی نوجوان آخرانسان تھا، انسان کے لئے ماحول کے اثرات سے بچنا کہاں تک ممکن ہے، خیال تو آہی جاتا ہے۔ لیکن جب کبھی ایسا ہوا تو غیب سے اس نوجوان کی حفاظت کی گئی۔ خود فرماتے ہیں:

"مجھے جاہلیت کی کسی بات کا کبھی خیال نہیں آیا، صرف دو دفعہ ایسا موقعہ آیا، مگر خدا تعالےٰ نے مجھے بچا لیا"

ایک رات کا ذکر ہے کہ میں نے اپنے ساتھی سے کہا جو میرے ساتھ بکریاں چرایا کرتا تھا کہ تم میری بکریوں کا خیال رکھنا میں مکہ جا کر ذرا کہانیاں سن آؤں۔ میں شہر میں آیا، ایک مکان کے سامنے سے گذرا تو وہاں سے گانے بجانے کی آواز آئی۔ میں نے پوچھا یہ کیسی آواز ہے؟ معلوم ہوا کہ فلاں شخص کی شادی ہے۔ میں گانا سننے کے خیال سے وہاں بیٹھ گیا۔ نوعمری کا زمانہ تھا لیکن بیٹھتے ہی میری آنکھ لگ گئی اور خدا تعالےٰ نے میرے کانوں پہ مہر لگا دی، پھر جو میں سویا تو خدا کی قسم آفتاب کی گرم گرم شعاعوں ہی نے مجھے بیدار کیا۔ فوراً اٹھا اپنے ساتھی کے پاس پہنچا۔ ساتھی نے پوچھا، کیا سنکر آئے میں نے سارا واقعہ اسے سنایا۔ دوسرے دن پھر یہی صورت پیش آئی۔ اس کے بعد پھر میرے دل میں کسی بیہودہ کام میں شریک ہونے کا خیال بھی نہیں ہوا، سوائے اس موقعہ کے جس سے خدا تعالیٰ نے مجھے محفوظ رکھا۔ یہاں تک کہ خدا تعالےٰ نے مجھے منصب نبوت سے سرفراز فرما دیا۔"

(خصائص کبریٰ، ج ۱ ص۸۹)

اس نوجوان کی فطرت میں شرم وحیا کا جو جوہر تھا اس کا اظہار اس موقعہ پر بھی بڑے حیرت انگیز طریقے پر ہوا جبکہ تعمیر کعبہ کے وقت آپ کا تہبند آپ کے چچا حضرت عباسؓ نے کھولا۔

واقعہ اس طرح پیش آیا کہ نبوت سے قبل جب قریش نے کعبہ کی از سر نو تعمیر کی تو اس میں حضورؐ نے بھی حصہ لیا۔ حضورؐ دوسرے لوگوں کے ساتھ سر پر پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے۔ چچا (حضرت عباسؓ) نے بھتیجے کو اس حالت میں دیکھ کر فرمایا، بیٹا تہبند کھول کر سر پر رکھ لے کہیں سر میں کوئی رگڑ نہ لگ جائے۔ حضورؐ نے چچا کے اصرار سے تہبند کھولا۔ ستر کا کھلنا تھا کہ آپ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔

ابوطفیل کی روایت میں ہے کہ اس وقت آپ کو غیب سے یہ آواز سنائی دی:

یا محمد عورتک — "محمد! اپنی شرمگاہ کا خیال رکھو۔"

یہ سب سے پہلی آواز تھی جو آپ کو سنائی دی۔

ابن عباس کی روایت میں ہے کہ ابو طالب نے آپ سے پوچھا، بیٹا! کیا ماجرا تھا؟ آپ نے فرمایا، مجھے ایک سفید پوش دکھائی دیا اس نے مجھ سے کہا، اے محمد! اپنے ستر کو چھپاؤ۔

(ابن سعد باب علامات النبوت، ص۹۳)

غور کیجئے! یہ بد اخلاق سوسائٹی میں ایسے بلند اخلاق رکھنے والا نوجوان، یہ شرک و بت پرستی میں خالص خدا پرستی کا متلاشی اور غیر اللہ

پرستی سے بیزار، ہاشمی لڑکا اپنی ممتاز شخصیت سے کس مستقبل کی خبر دے رہا تھا۔

قتل وغارتگری

معمولی معمولی باتوں پر لڑنا مرنا، قتل و غارت گری پر تیار ہوجانا، عرب کا عام شیوہ تھا۔ ذرا سی بات پر جنگ شروع ہوتی اور برسوں چلتی رہتی۔ گھوڑ دوڑ پر جنگ چھڑی تو دو قبیلوں کے درمیان چالیس[۴] سال تک خونریزی ہوتی رہی۔ کسی کی اونٹنی کھیت میں گھس گئی کھیت والے نے اونٹنی کا تھن زخمی کر دیا بس خون کی ندیاں بہہ گئیں۔

یہ حالت تھی عرب کی اور یہ سب کچھ عزت اور وقار، باپ دادا کے نام اور سرداری کی لاج رکھنے کے لئے ہوتا تھا۔

ان سفاکوں اور لڑاکوؤں کے درمیان ایک ہی شخص تھا جو اپنی صلح جوئی اور امن پسندی میں دور دور تک مشہور تھا۔ یہ ۲۵ سال نوجوان تھا عہد شباب کے انتہائی جوش کی منزل سے گذر رہا تھا مگر اتنا صلح کل تھا کہ اپنی مصالحانہ طبیعت سے جنگ و پیکار کی بھڑکنے والی آگ کو سرد کر دیا کرتا تھا۔

عرب میں اس کی عزت کسی بڑے سے بڑے سردار کے مقابلہ میں بھی کم نہ تھی لیکن یہ نام و نمود سے کوسوں دور رہا کرتا تھا۔

حجر اسود کا واقعہ اسی وقت پیش آیا جب کہ آپ ۲۵ سال کے تھے یعنی جب کعبہ کی تعمیر ہوئی تو مختلف قبائل نے کعبہ کے مختلف حصے آپس

میں تقسیم کرلے تاکہ ہر قبیلہ اس شرف و سعادت میں شریک ہو جائے تعمیر کے بعد جب حجر اسود نصب کرنے کا موقع آیا تو تمام قبیلوں کے درمیان جھگڑا کھڑا ہو گیا، ہر قبیلہ یہی چاہتا تھا کہ یہ سعادت میرے حصے میں آئے۔ بات اتنی بڑھی کہ تلواریں نکل آئیں، خون سے لبریز پیالوں میں انگلیاں ڈبو ڈبو کر قسمیں کھائی جانے لگیں۔

اسی جھک جھک میں چار دن ہو گئے، پانچویں دن قریش کے ایک معمر سردار ابوامیہ بن مغیرہ نے یہ رائے پیش کی کہ بھئی ایسا کرو کہ جو شخص صبح کو سب سے پہلے کعبہ میں آجائے اسی کو اس معاملہ میں ثالث قرار دیدیا جائے۔ سب نے بخوشی یہ رائے تسلیم کر لی۔ صبح کو ہر شخص سب سے پہلے پہنچنے کے ارادے سے جلدی جلدی گھر سے نکلا۔ لیکن وہاں پہنچکر کیا دیکھا کہ عرب کا وہ جواں سال و جواں بخت کعبہ میں سب سے پہلے موجود ہے جس کو عبداللہ کا یتیم کہتے ہیں۔

قرار داد کے مطابق آپ کو حق پہنچ گیا کہ اگر آپ حجر اسود کو تنہا نصب کرنا چاہیں تو کر دیں۔ لیکن آپ کی صلح جوئی اور اتحاد پسندی نے اس کو گوارا نہ کیا۔ ارشاد فرمایا جو قبیلے اپنے آپ کو اس شرف و عزت کا مستحق سمجھتے ہیں وہ اپنا ایک ایک نمائندہ چن کر مجھے دیں۔ ادھر آپ نے اپنی چادر مبارک بچھائی اور اس پر حجر اسود رکھ دیا۔ پھر ان منتخب نمائندوں سے کہا کہ وہ چادر کے کونے پکڑ کر اٹھائیں اور اسے کعبہ کی دیوار تک لیکر چلیں، جب حجر اسود اپنی جگہ کے پاس آگیا تو آپ نے اسے اٹھا کر

اس کی جگہ پر نصب کر دیا۔

ہاشمی نوجوان کی اس حسن تدبیر پر بڑے بڑے سردار عش عش کرنے لگے۔ کیونکہ آپ نے حقدار ہوتے ہوئے بھی ایثار سے کام لیا اور سب کا دل رکھا۔ عرب کی عام روایات میں یہ ایثار اور صلح پسندی اپنی مثال آپ ہی تھی۔

عرب کی مشہور جنگ "حرب فجار" میں آپ نے شرکت فرمائی۔ جاہلیت کی لڑائیوں میں یہ لڑائی سب سے زیادہ خطرناک تھی۔ قریش اس جنگ میں حق بجانب تھے، پھر خاندان کے ننگ و نام کا بھی معاملہ تھا اس لئے آپ شریک ہوئے مگر آپ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔

مورخین نے لکھا ہے کہ آپ نے اس لڑائی میں جنگ نہیں کی حالانکہ آپ لڑائی کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لڑائی ایام الحرام میں پیش آئی تھی۔

(سیرت النبی جلد اول صفحہ ۱)

خیانت اور لوٹ مار

ایک دوسرے کا مال و اسباب لوٹ لینا عرب کا معمولی کھیل تھا۔ اکثر قبائل کا تو ذریعہ معاش ہی راہزنی تھی۔ ایسے ماحول میں امانت و دیانت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ وہی ایک ہاشمی نوجوان ہے جسے کسی نے بھی بدمعاملگی کرتے نہیں دیکھا، حق تلفی کرتے نہیں پکڑا۔ اس نے برسوں سوداگری کا پیشہ کیا مگر کسی شخص کا ایک پیسہ بھی ناجائز طریقے سے نہیں لیا۔ جس سے ایک دفعہ معاملہ کیا اس کے دل پر اپنی ایمانداری کا سکہ بٹھا دیا۔ آہستہ آہستہ اس کی امانت و

دیانت پر عوام و خواص سب کا بھروسہ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ساری قوم اس کو امین کہنے لگی اور دوست و دشمن سب اس کے پاس اپنا قیمتی مال رکھوانے لگے۔

اب اس کو مکہ کا ہر چھوٹا بڑا امین کہہ کر پکارتا تھا اور مکہ کا یہ امین عہد کا پکا اور وعدہ کا سچا تھا اور یہ اوصاف اسی وقت بدرجہ اتم موجود تھے، جب وہ ایک سوداگری و تاجر کی حیثیت سے شام، بصرے اور یمن کے سفر کر رہا تھا۔

عبداللہ ابن ابی الحمسا ایک صحابی۔ بیان کرتے ہیں کہ بعثت سے پہلے میں نے حضورؐ سے خرید و فروخت کا ایک معاملہ کیا تھا۔ کچھ معاملہ ہو چکا تھا کچھ باقی تھا میں نے وعدہ کیا کہ پھر آؤں گا۔ پھر اتفاق سے تین دن تک مجھے اپنا وعدہ یاد نہ آیا۔ تیسرے دن جب میں موقعہ پر پہنچا تو حضورؐ کو اسی جگہ منتظر پایا نہ آپ کی پیشانی پر اس وعدہ خلافی کی وجہ سے کوئی بل تھا نہ زبان پر کسی قسم کی شکایت، البتہ صرف اتنا فرمایا "تم نے مجھے تکلیف دی میں اس جگہ تین دن سے موجود ہوں" (سیرت النبی جلد اول)

حضرت سائب نامی ایک صحابی جب مسلمان ہو کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو لوگوں نے ان کی تعریف کی کہ یہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ آپ نے فرمایا، سائب کو تم سے زیادہ میں جانتا ہوں، سائب بولے میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، آپ میرے شریک تجارت تھے، میں نے ہمیشہ آپ کو معاملہ کا صاف پایا۔ فکنت لا تداری ولا تماری۔

(سیرت النبی صفحہ ۱۷۲)

"امین" (امانت دار) یہ حضورؐ کی وہ صفت ہے جو نبوت سے پہلے مکہ کے بچے بچے کی زبان پر تھی۔ حضورؐ کی یہ مرکزی صفت دراصل ایک صفت نہیں، آپ کی بہت سی صفات کا سرچشمہ ہے، بہت سی اخلاقی خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ دوست دشمن سب آپ کو اپنے مالوں کا بہترین محافظ سمجھتے تھے لیکن اس میں اس امر کا اعلان تھا کہ ایک وقت آنے والا ہے جب خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی جانیں اور مال، ان کے حقوق واملاک اور ان کی دنیا اور آخرت مکہ کے الامین کی سپردگی و حفاظت میں دے گا اور یہ ان سب چیزوں کی ایسی حفاظت کرے گا کہ دنیا کے بڑے بڑے شہنشاہ تعجب سے دانتوں میں انگلیاں دیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر پیغمبر نے اپنی قوم کو یقین دلایا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے امین بنایا ہے، میں جھوٹا اور فریبی نہیں ہوں جو تمہارے فکر و عمل کی دنیا کو برباد کر دوں۔ میں نہایت معتبر رسول ہوں جو پوری ذمہ داری سے خدا کے احکام سے تمہیں باخبر کرتا ہوں۔

خدا تعالیٰ نے نبوت سے پہلے "محمدؐ" کو امین کہلوایا تاکہ زمانہ نبوت میں جب آپ کے بدترین مخالفین آپ کی نبوت سے انکار کریں تو انہیں یہ کہہ کر قائل کیا جائے کہ جس شخص نے تمہارے روپے پیسے میں آج تک خیانت نہیں کی وہ خدا کے احکام اس کے بندوں تک پہنچاتے میں کمی بیشی کیسے کر سکتا ہے۔

خدا تعالیٰ نے اسی لئے اپنی شریعت کو "امانت" کہا ہے:

انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوات والارض والجبال فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسان۔ (احزاب ۹)	"ہم نے امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔"

انبیاء سابقین میں قوم عاد کے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام نے ان الفاظ میں اپنی امانت داری کا اعلان فرمایا:

ابلغکم رسالت ربی و انا لکم ناصح امین۔ (اعراف ۹)	"پہنچاتا ہوں تم کو پیغام اپنے رب کے اور میں تمہارا خیر خواہ اطمینان کے لائق ہوں۔"

حضرت یوسف علیہ السلام جب شاہ مصر کے پاس آئے اور شاہ نے ان سے بالمشافہ بات چیت کی تو دل میں یوسف کی عظمت کچھ تو پہلے ہی سے موجود تھی اب سیاسی اور اقتصادی معاملات پر ان کی مدبرانہ گفتگو نے شاہ کو اپنا گرویدہ کر لیا اور اعلان کیا:

فلما کلمہ قال انک الیوم لدینا مکین امین۔ (سورۂ یوسف ۷)	"پھر جب بات چیت کی اس سے کہا واقعی تو نے آج سے ہمارے پاس جگہ پائی معتبر ہو کر۔"

حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام نے جن الفاظ میں اپنے "امین" ہونے کا اعلان کیا وہ سورۂ شعراء میں قرآن

نے اس طرح نقل کیا ہے:

انی لکم رسول امین فاتقوا اللہ واطیعون۔ (سورۂ شعراء)	"میں تمہارے پاس پیغام لانے والا ہوں معتبر، سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شیخ مدین کی عفت مآب بیٹی نے تو ان الفاظ میں امین کا خطاب دیا ہی تھا:

"ان خیر من استاجرت القوی الامین"

لیکن خود نبوت کے بعد حضرت موسیٰؑ نے بھی ان الفاظ میں امین ہونے کا دعویٰ کیا:

ان ادوا الی عباد اللہ انی لکم رسول امین۔ (سورۂ دخان ا)	"حوالے کرو میرے، بندے خدا کے میں تمہارے پاس آیا ہوں بھیجا ہوا معتبر۔"

حضرت ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا جامع تبصرہ:

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے کی مبارک زندگی کے آثار و علامات پر حضرت امام ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ کے آخر میں ایک نہایت ہی جامع اور مختصر تبصرہ فرمایا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تبصرہ پر اس مضمون کو ختم کیا جائے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں ــــ حضورؐ کے اوصاف حمیدہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

اسی طرح خدا تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو اس قسم کے اوصاف حمیدہ پر پیدا فرماتا ہے اور فطری طور پہ پاکیزہ عادات و اطوار کی طرف ان کا میلان ہوتا ہے۔

حضورؐ کی والدہ نے حالت حمل میں یہ خواب دیکھا کہ ایک نور ان کے اندر سے نکلا جس سے تمام زمین روشن ہو گئی۔ معبروں نے اس خواب کی تعبیر دی اور کہا۔ تمہارے بطن سے ایک بابرکت لڑکا پیدا ہوگا جس کا دین مشرق سے مغرب تک پھیل جائے گا۔

جنات نے حضورؐ کی ولادت باسعادت کی خبریں دیں، نجومیوں اور کاہنوں نے آپ کی جلالت قدر کی بشارتیں سنائیں۔ واقعات عالم مثلاً کسریٰ کے محل کے کنگروں کے ٹوٹنے وغیرہ نے پیدائش کی اہمیت پر دلالت کی۔ آپ کے وجود مسعود سے نبوت کی دلیلیں آشکارا ہوئیں۔ جیسے ہرقل روم نے ان کی طرف اشارہ کیا۔ آپ کی ولادت اور رضاعت کے زمانہ میں لوگوں نے برکت کے آثار دیکھے، فرشتوں نے ظاہر ہو کر آپ کے سینہ مبارک کو شق کیا اور آپ کے دل میں ایمان و حکمت کی روشنی بھر دی۔ شق صدر کا یہ واقعہ عالم شہود اور عالم اور عالم مثال کے درمیان پیش آیا، اسی لئے شق صدر سے آپ ہلاک نہیں ہوتے البتہ سینہ پر ہلکا نشان باقی رہا۔

یہی صورت پیش آیا کرتی ہے ان تمام واقعات میں جن میں عالم مثال اور عالم شہود دونوں کے اثبات جمع ہو جاتے ہیں۔

حضورؐ جب حضرت ابوطالب کے ساتھ شام کے سفر میں تشریف

لے گئے تو ایک مشہور راہب نے آپ کے چہرے پر اور آپ کے حالات میں نبوت کی علامات پاکر آپ کی نبوت کا اقرار کیا۔

جب حضور جوانی کے کمال کو پہنچے تو آپ میں ملکیت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور فرشتوں کے ساتھ مناسبت و تعلق پیدا ہونے لگا۔ اس کا اظہار کبھی اس طرح ہوتا کہ کوئی غیبی آواز سنائی دیتی اور کبھی اس طرح ہوتا کہ کوئی فرشتہ جسمانی صورت میں دکھائی دیتا۔

حضورؐ جب جوان ہو گئے تو خدا تعالےٰ نے آپ کے انسانی حوائج پورا کرنے کی یہ سبیل نکالی کہ حضرت خدیجہ کبریٰ کے دل میں آپ کی محبت ڈال دی اور ان میں آپ کے ساتھ ہمدردی کا خیال پیدا ہو گیا۔ حالانکہ حضرت خدیجہ مکہ کی مالدار عورتوں میں سے تھیں اور آپ غریب تھے)

خدا تعالیٰ کا دستور بھی یہی ہے کہ جب وہ اپنے کسی بندے سے محبت کرنے لگتا ہے تو اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو اس کا معین و مددگار بنا دیتا ہے۔

تعمیر کعبہ کے موقعہ پر جب آپ نے اپنا تہبند اتار کر کندھے پر ڈالا اور اس سے آپ کا ستر کھلا تو آپ اس سے بے ہوش ہو گئے اور بیہوشی کی حالت ہی میں آپ نے منع فرمایا کہ کہیں شرمگاہ ظاہر نہ ہو جائے۔ یہ نبوت کی ایک طاقت تھی نفس کے مواخذہ کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے۔

اس کے بعد آپ خلوت کو پسند فرمانے لگے۔ مقام حرا میں تشریف لے جاتے اور اس میں کئی کئی رات تک گوشہ نشین رہتے جب غذا ختم ہو جاتی

تو گھر واپس آجاتے اور پھر کھانا ساتھ لیکر چلے جاتے۔

غلبہ روحانیت نے دنیا سے آپ کی توجہ کو ہٹا دیا تھا اور ہمہ تن آپ کا رخ اس فطرت کی طرف پھیر دیا تھا جس پر خدا تعالےٰ نے انسانوں کو تخلیق فرمایا ہے۔

منصب نبوت پر فائز ہونے سے آپ پر رویائے صالحہ میں انکشاف کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو خواب آپ دیکھتے اس کی تعبیر اس طرح واضح طور پر آپ کے سامنے آجاتی جس طرح صبح کی روشنی۔

یہ بھی نبوت کی طاقت کا ظہور تھا، اس کے بعد پھر باقاعدہ نزول وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

(حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم صفحہ ۲۰۵)

نبوت سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی زندگی میں جو نمایاں اوصاف و امتیازات ہوتے ہیں، ان سطروں میں ان پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے انہیں غور سے پڑھئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ کیا ایک مصلح اور نبی میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور کیا ہر مصلح یا ریفارمر کو پیغمبر یا رسول کے الفاظ سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

••

فخر موجودات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے
اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنے والی

ہمارے نبی کی پاک بیبیاں

مخالفین اسلام کے کھوکھلے اعتراضات کا مدلل جواب دینے کے لئے رسول پاک کی ازواج مطہرات کے بارے میں مفصل معلوماتی کتاب جس میں نبی کی شان اور وقار کو ملحوظ رکھ کر یہ بتایا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سی بیوی سے کن حالات میں نکاح کیا ؟ خدا کے احکامات کی کس طرح پیروی کرتے ہوئے کس کس عمر میں نکاح کئے ؟ کون سی بیوی سے کتنی اولادیں ہوئیں ؟ "ہمارے نبی کی پاک بیبیاں" کتاب میں امت کی ماؤں کے پورے حالات درج ہیں۔ قیمت ۶۲ نئے پیسے۔

مکتبہ دینیات آصف علی روڈ نئی دہلی